جی خراب رہتا ہے

شعری مجموعہ

تسلیم نیازی

یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی کے جزوی مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے نیز شائع شدہ مواد سے اردو کونسل کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

کتاب کا نام	☙	جی خراب رہتا ہے
صنف	☙	شاعری
مصنف	☙	تسلیم نیازی
تہذیب وتزئین	☙	احمد نثار (دھنباد)، نشاط احمد دیوانہ
سرورق ڈیزائن	☙	تسلیم نیازی
طباعت	☙	
کمپوزنگ	☙	مہتاب
تقسیم کار	☙	
اشاعت اول	☙	
تعدادِ اشاعت	☙	۵۰۰
قیمت	☙	۱۰۷

انتساب

ادب نواز اور اردو سے بے پناہ محبت کرنے والے

نوجوان **شھنواز حسین** کے نام!

جس کے تعاون کے بغیر کتاب کی اشاعت مشکل تھی۔

تسلیم نیازی

تسلیم نیازی اپنے فن کے آئینے میں

پروفیسر ڈاکٹر علیم اللہ حالی

آج سے کوئی پندرہ بیس سال پہلے مجھے تسلیم نیازی کی شاعری کا عرفان حاصل ہوا تھا۔میں نے اس کا اعتراف بھی کیا تھا لیکن یکا یک ایک طویل عرصے تک وہ اپنی خاموشیوں کی دھند میں کہیں کھو گئے۔میں اس گوہر گم گشتہ کی بازیافت کے لئے شور و غوغا کرتا رہا لیکن ان کی بے نیازی کے سامنے مجھے سپر انداختہ ہونا پڑا۔ادھر دو تین سال قبل ایک محفل شعر و ادب میں شرکت کے لئے آسنسول گیا تو انہیں تلاش کیا، وہ مل گئے۔خاموشی کا سبب دریافت کیا تو ''فکر معاش، عشق بتاں، یادرفتگاں'' جیسے گھسے پٹے جواب سے مجھے مطمئن کرنا چاہا۔اس ملاقات میں مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ میں جسے ان کی خاموشی سمجھے ہوا تھا وہ دراصل ان کے اس مجاہدے کی صورت حال تھی جس کے تحت وہ اس مدت میں اپنے اندرون میں اتر کو غزل سے ''صحبت صحیحہ'' کے عمل میں مصروف تھے۔ان کا کلام سنا تو پتہ چلا کہ یہ سارے مہ و سال بیکار نہیں گئے تھے، اس عرصے میں وہ غزل میں مکمل طور پر اترنے اور اسے اپنے اندر اتارنے کے یوگا میں مہارت حاصل کر چکے تھے۔

غزل بنیادی طور پر نیم گفتنی کا آرٹ ہے اور غور کیا جائے تو یہ کام اظہار و بیان کی سطح پر نہایت دشوار ہے۔غزل کے شاعر کے پاس وہ شعور یا وہ ہنر ہونا ضروری ہے جس کے ذریعہ اسے معلوم ہو سکے کہ وہ تخلیقی تجربے کے کس حصے کو خفا میں رکھے اور کہاں سے اسے ظاہر کرے۔پھر یہ بھی ہے کہ اظہار و اخفا کے مناسب تناسب کا احساس و اندازہ بھی ہو۔کن محسوسات و کیفیات کے جزوی اظہار سے ان کی شدت تک رسائی حاصل ہو سکتی ہے۔اس کے تخمینہ کرنے کا سبق کلیتاً سیکھنے سکھانے سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ یہ اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب فنکار کے پاس غیب سے مضامین اترنے لگتے ہیں اور اس کے صریر خامہ میں نوائے سروش کی خصوصیت پیدا ہو جاتی ہے۔

اچھے اشعار کی تفہیم کا مسئلہ یہیں حاصل نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے لئے قاری کی اس غیر معمولی

ذہانت اور انتقادی حس کی ضرورت بھی ہوتی ہے جو اختراع اور تخلیق سے قریب ہو۔ایسا قاری ناگفتہ کو بھی سرحد گفتار تک لے آتا ہے۔یہاں قاری فنکار کی تخلیقی شخصیت کی تکمیل کا ذریعہ بن جاتا ہے۔وہ ان معنوی Gaps کو بھی پر کرتا ہے جسے پر کرنا یا تو فنکار ضروری نہیں سمجھتا یا جو اس کے حلقۂ اظہار میں آنے سے رہ جاتے ہیں۔اس طرح شعر میں مفہوم کی تکثیریت پیدا ہوتی ہے اور فنکار کے ذریعہ تعمیر شدہ آئینہ عام قاری کے پاس پہنچ کر نگارخانہ بن جاتا ہے۔

تسلیم نیازی تخلیق شعر کے ان نازک امور سے واقف ہیں۔ان کے اشعار ذہین قاری کی شرکت ضروری سمجھتے ہیں۔اشعار کی لطافت اس وقت سوا ہو جاتی ہے جب قاری احساس وخیال کی Galloping کی صلاحیت رکھتا ہو۔ان کے اظہار کی سادگی اور سہل بیانی اکثر وبیشتر دھوکا بھی پیدا کرسکتی ہے۔ان کے تخلیقی میلان کو میر سے قریبی نسبت ہے۔میر ہی کی طرح تسلیم نیازی کے سادہ سے سادہ شعر میں احساس وفکر کا ناقابلِ پیمائش عمق ہے۔نیم گفتنی کی فضا میں اس گہرائی کو مندرجہ ذیل اشعار کے ذریعہ بطور خاص محسوس کیا جاسکتا ہے:

ایک مدت پہ کوئی پوچھنے آیا ہے مزاج
آج ہوتے جو مری آنکھ میں آنسو موجود

میرے دل سے وہ نکل کر دیکھے
دیر اتنا سا حرم اتنا سا

نالہ کبھی فرازِ جگر تک نہیں گیا
آنسو کبھی نشیبِ نگہہ تک نہیں گئے

پلکوں پہ جگنوؤں کا تقرر نہیں تو کیا
آنکھوں میں تیرگی سے تعصب ضرور ہو

بیش وکم کوئی پیادہ، کوئی فرزیں، کوئی رخ
کون اِس شہر میں اُس شخص کا مہرہ نہ ہوا

رہائی ہاتھ نے دے دی تو پھینکا جال آنکھوں نے
قفس سے اُڑ گیا تو تا تو روشندان پر بیٹھا

تری گاڑی میں اے دنیا، نشستیں سب کی خاطر تھیں
میں اک تنہا مسافر رہ گیا سامان پر بیٹھا

محسوسات کے داخل میں سرایت کرتے ہوئے اور معانی کے اندرون میں طبق طبق تہیں بنانے والے تسلیم نیازی کے اور بھی اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں۔میں نے تو بطور نمونہ تسلیم کو یہ بشارت دینے کے لئے محض چند اشعار نقل کیے ہیں کہ انہیں میر کی چھت مل چکی ہے:

مجھ ایسے خاک نشینوں کی دل دہی کے لئے
کبھی تو میر کی چھت سے اتر کے آئے غزل

تسلیم نیازی کی شاعری موضوعاتی تنوع کے لحاظ سے بھی متمول ہے۔سماجی تقاضے (Social Commitments) نیازی کے یہاں شعری اشارات کے ذریعہ ادا ہوتے ہیں۔اس لئے یہ بھی ان کے منفرد تخلیقی رویے کی پہچان بن جاتے ہیں۔معاشرت، سیاست، عالمی مسائل، اجتماعی کرب، محبت، جنس، صارفی نظام میں بدلتے ہوئے انسانی رشتے....غرض وہ سارے مشاہدات نیازی کے یہاں موجود ہیں جو عصر حاضر کے ذہن بیدار کا پتہ دیتے ہیں۔لیکن نیازی نے ہر مقام پر غزل کو ناغزل بننے سے بچالیا ہے۔یہ ایک اہم بات ہے کہ نیازی کے یہاں تندی صہبا کے باوجود آبگینے کے پگھلنے کا احساس نہیں ہوتا۔وہ غزل میں تصرفات کی حدیں بھی جانتے ہیں۔انہیں یہ احساس ہے کہ:

غزلیں مری منظور ہیں کچھ اہلِ نظر کو
ہرچند کہ دربارِ تغزل کی ہیں راندی

مجھے یقین ہے کہ اس مجموعے کی اشاعت کے بعد تسلیم نیازی کا وہ احساس دور ہوجائے گا جو محولہ بالا شعر کے دوسرے مصرع سے ظاہر ہوتا ہے۔ قارئین اور خود فنکار کو یہ اندازہ ہوجائے گا کہ تسلیم نیازی انفرادی لہجے کے ساتھ تغزل کے مفہوم میں اضافہ کررہے ہیں۔ اس دعویٰ کی دلیل کے طور پر دو تین اشعار اور دیکھیے :

اس کی خنک مزاجئ ظاہر پہ تو نہ جا
بیٹھی ہے چھپ کے جھیل کی گہرائیوں میں آگ

وہ سراپا ناز ہے غیروں کا داعی ان دنوں
مجھ پہ تو نافذ ہے حکمِ امتناعی ان دنوں

پلکوں پہ جگنوؤں کا تقرر نہیں تو کیا
آنکھوں میں تیرگی سے تعصب ضرور ہو

تو دور ہے تو دل پہ ہے قابض ترا خیال
جاتا نہیں ہے چھوڑ کے یہ جن کسی طرح

تسلیم نیازی کی شاعری سیلِ تند خو نہیں بلکہ جوئے نغمہ کی ضامن ہے کہ غزل ہم سے اس کا تقاضا کرتی ہے۔ میں نیازی کے تازہ مجموعے کا انتظار کررہا ہوں۔

ایک تنقید گزیدہ شاعر -- تسلیم نیازی

ڈاکٹر پروفیسر عاصم شہنواز شبلی

یہ ہمارے شعروادب کا بڑا المیہ رہا ہے۔ کہ ہم اپنے جینوئن فنکاروں اور تخلیق کاروں کو ان کا صحیح مقام ومرتبہ نہیں دے پاتے ہیں اور جانتے بوجھتے ان سے بے اعتنائی برتتے چلے جاتے ہیں اور جو گونج اور دھمک قلمکاروں کی تخالیق یا فنکاری کی سنائی دینی چاہئے وہ نہیں ہو پاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے شاعروادیب اہل نظر کی پالیسیوں کے تحت بددل ہوجاتے ہیں اور آہستہ آہستہ خود کو عزلت پسندی کی سرحد پر پہنچا دیتے ہیں۔ جب کہ ان سے کم تر درجے کے شاعروں اور ادیبوں کو شعوری کوشش کے ذریعہ کھینچ تان کر قد بڑھانے کے عمل سے گزارا جاتا ہے اور انہیں بانس پر چڑھا دیا جاتا ہے اور ہر طرف انہی ناموں کا چرچہ بھی ہونے لگتا ہے۔ شاعری بالخصوص غزل گویوں کے ساتھ معاملہ اور بھی زیادہ گمبھیر ہوجاتا ہے۔ شاعر نما ''مسخروں'' کو لوگوں نے شاعر کا نام دے دیا ہے اور ''امام ادب'' نے بھی ان کی شاعری پر اپنی مہر ثبت کردی ہے۔ ایسے پست ذہنیت اور نام ونہاد شاعروں کو نہ تو زبان وبیان کا علم ہے، نہ غزل کی تہذیب کی واقفیت ہے اور نہ ہی اظہار وابلاغ کے وسائل کا ادراک وعرفان ہے۔ گروہ بندی، علاقائی عصبیت، ذاتی تعلق، تاجرانہ رویہ، دکانداری، خیمہ سازی، چرب زبانی اور ڈرامائیت کے ذریعہ ایسے غزل کو اپنے آپ کو بڑا شاعر تسلیم کرانے کی جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں۔ زبان وبیان اور علم وعرفان کے فقدان کی وجہ سے ایسے شاعروں کے یہاں نہ زبان کا حسن ہے اور نہ بیان کا لطف، نہ تخلیقیت کا جوہر ہے اور نہ اسلوب کا کیف، نہ فن کا عرفان ہے اور نہ اظہار کا سلیقہ۔ جب کہ حقیقی، کھرے اور سچے شاعروں کو ناقدری محرومی، شکست اور ناشناسی کا شکار ہونا پڑ رہا ہے۔ ہمارے یہاں ایسے شاعر بہت ہیں جن کے یہاں Potentiality بھی ہے اور جو اپنی شاعرانہ ندرت ووحدت، تمازت وطراوت، تازگی وشگفتگی، اہتمام والتزام، آب وتاب اور

انحراف وانجذاب کی وجہ سے نہ صرف بڑے بانکے اور سجیلے نظر آتے ہیں بلکہ اردو غزل کو نئی جہات و آفاق سے آشنا کرتے ہوئے نئے جہانِ معنی کی سیر بھی کراتے ہیں اور اذہان کو ایک نئی تخلیقی چمک سے خیرہ بھی کرتے رہتے ہیں۔ایسے شاعروں میں عین تابش،اکرام خاور، عالم خورشید،عنبر شمیم، رونق شہری، شمیم قاسمی،خورشید اکبر، ملک زادہ جاوید، راشد طراز، صالح ندیم، شہپر رسول اور رسول ساقی کے ساتھ تسلیم نیازی کا بھی شمار ہوتا ہے جن کی شاعری پر کھل کر مکالمہ کرنے کی ضرورت ہمارے ناقدین نے محسوس نہیں کی۔

تسلیم نیازی ایک جینوئن شاعر ہیں جن کے فکری وفنی ابعاد و جہات متنوع اور رنگا رنگ رہے ہیں۔وہ ایک عرصے سے تخلیقی جوت جگا رہے ہیں اور اپنی تخلیقی قوت کی چھاپ بھی انہوں نے چھوڑی ہے۔تسلیم نیازی کی ذکاوت و ذہانت، فہم و فراست، ادراک و عرفان، علم و آگہی، جلال و جمال، بصیرت و بصارت، عصریت و شریت اور روشن تعبیر اپنے ہم عصروں سے قدرے مختلف اور زیادہ رہی ہیں۔انہوں نے اپنی شاعری کا رشتہ تخلیقی عمل اور تخلیقیت سے گہرے طور پر جوڑے رکھا ہے۔اس لئے ان کے یہاں ہم آہنگی کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔انہوں نے سچے تخلیق کار کی طرح تخلیقیت کی تمام تر پیچیدگیوں الجھنوں اور نزاکتوں سے گزر کر اپنی تخالیق کو مکمل خدوخال عطا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہمیں تسلیم نیازی کی شاعری متاثر، متحرک اور مضطرب کرتی ہے۔ان کے شعری کائنات کے مطالعہ و محاسبہ سے ہمیں اپنے عہد کی روایات، تاریخ، معاشرتی نظام، تہذیب و ثقافت، جبر و قہر، مصلحت کوشی اور زندگی کے مختلف تضادات و تصادمات کا احساس و ادراک بھی ہوتا ہے اور ہم ان احساسات و واردات اور ادراکات و اکتسابات کی حدوں کو بھی مَس کرتے ہیں جن سے شاعر ہو کر گزرتا ہے۔

تسلیم نیازی ایک پختہ کار اور ہفت رنگ شاعر ہیں۔ان کی تخلیقی توانائی تیزی کے ساتھ ان آفاق کی طرف گامزن ہے جہاں کچھ نئے ابعاد و جہات روشن بھی ہو رہے ہیں اور اضافہ بھی ہو رہا ہے۔بالخصوص غزل کے قیمتی سرمایے کو ثروت مند بنانے کی تگ و دو میں کوشاں ہیں۔

تسلیم نیازی کا پہلا شعری مجموعہ ''ڈالفن'' ۱۹۹۲ء میں منظر عام پر آیا تھا۔جس نے اس بات کی بشارت دے دی تھی کہ اظہار و بیان کی سطح پر انہیں شاعری کا عرفان حاصل ہو چکا ہے اور ان

کی فنکاری تابنا کی وضو باری کی جانب گامزن ہے اور یہی تابنا کی وضو فشانی انہیں نہ صرف قادر الکلام بلکہ قادر البیان شاعروں کی صف لا کھڑا کرے گی۔پھر بیس سال کے وقفے کے بعد ۲۰۱۲ء میں ان کا دیوان ''لہو شعر'' منصۂ شہود پر آیا۔ان بیس سال کے عرصے میں تسلیم نیازی خوب سے خوب تر کی جانب گامزن رہے۔انہوں نے اپنی محنت و ریاضت سے اپنے فن کو مزید صیقل کیا اور نئے آفاق سے ہم کلام ہوئے۔''لہو شعر'' کی شاعری میں تسلیم نیازی کا تخلیقی رویہ، لہجہ، مزاج، اسلوب اور رنگ و آہنگ انہیں اپنے ہم عصروں سے ممتاز و ممیز کرتے ہیں اور یہیں سے ان کا انفرادو امتیاز قائم ہوتا ہے۔

تسلیم نیازی کسی ایک صنف کے پابند نہیں۔متعدد صنفوں سے ان کی وابستگی کا پتہ چلتا ہے۔ان کی تخلیقاتی کائنات میں غزل کے علاوہ نظم، رباعی، قصیدہ، قطعات، واسوخت، ریختی وغیرہ سبھی شامل ہیں۔اور ہر ایک صنف میں ان کے فکر و فن کی جولانی و انکشاف قابل دید و داد ہیں۔لیکن غزلیہ کارنامے کلیدی ہیں۔تسلیم نیازی کا شعری وجدان کئی لحاظ سے توجہ طلب ہے اور ان کی شعری بوطیقا میں فنی چابکدستی کا مظاہرہ ہے۔ان کا مطالعہ نہ صرف وسیع ہے بلکہ اس مطالعے میں عمق بھی ہے۔تسلیم نیازی شاعری کے ارتقائی سفر سے آگاہ ہیں، اس کے حسن و قبح سے واقف ہیں، احساس جمال کا عرفان ہے، شعور و ادراک کا گیان ہے، تخیل کی فراوانی ہے۔ لفظوں کو معنویت سے ہم کنار کرنے کی آگہی ہے جس نے ان کے ذہن کو صیقل کیا ہے۔شاعری کے ضروری نکات سے واقفیت نے ان کے کلام میں چیدہ اوصاف کو برتنے کا سلیقہ اور قدرت عطا کیا ہے۔تسلیم نیازی شاعرانہ ڈکشن سے باخبر ہیں۔انہیں علم ہے کہ تازہ تر احساسات کس طرح شعری پیکر میں ڈھل سکتے ہیں۔فنی اعتبار سے بندش کی چستی، بیان کی دلکشی، الفاظ و تراکیب کا مستحکم در و بست، فکر و شعور کی ہمواری، جذبے کی صداقت و لطافت، خیال کی صفائی و روانی، معنی کی تہہ داری و طرحداری ان کی شاعری میں ہر جگہ موجود ہیں اور جو اس بات پر دال ہیں کہ جتنے نقوش اور جتنے سنگ میل انہوں نے نصب کئے ہیں وہ فکری و فنی سطح پر انہیں بیدار مغز شاعروں کی فہرست میں متمکن کرتے ہیں۔تسلیم نیازی کا اپنا وجدان، اپنا فکری شعور، اپنا مشاہدہ اور تجربہ انہیں نہ صرف گھسے پٹے راستوں سے الگ کرتے ہیں بلکہ انفرادی صورت بھی پیدا

کرتے ہیں۔ ''لہو شعر'' میں شامل تمام اصناف کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ اپنی بات سادہ، صاف اور تخلیقی زبان والفاظ میں پیش کی گئی ہے۔ان میں سلاست ہے، روانی ہے، برجستگی ہے، تہذیب وشائستگی ہے، شفافیت ہے، زندگی کا مکمل اور بھر پور احساس ہے۔ جستجو کا رنگ ہے، استعجاب ہے، تہذیب وشائستگی ہے اور نئے عہد کی تخلیقیت اور حقیقت نگاری ہے۔ گویا ان کے یہاں کہیں تحکیم وتجربہ ہے تو کہیں عبرت وانتباہ، کہیں ان کی اپنی دلچسپیاں ہیں تو کہیں معاشرے کا دباؤ، کہیں خاص طرح کے حالات ہیں تو کہیں امکانات اور یہ ساری چیزیں مل کر انہیں ایک نیا راستہ بنانے کی ترغیب دیتی ہیں، ایک تجسس کی کیفیت پیدا کرتی ہیں اور اپنی دنیا کی تفہیم کرتی ہیں ۔اس طرح زندگی کے تلخ وترش تجربے اور شادمانی ورعنائی کے نمونے ان کے کلام میں در آئے ہیں ۔

وسیع تر پہلوؤں کو اپنے تجربات ومشاہدات کے آئینے میں کچھ اس طرح دیکھا ہے کہ ان کی شاعری کے آفاق میں جدید اور جدید تر حسیت کا منظر نامہ واضح طور پر ابھر کر سامنے آ گیا ہے ۔ اور ہر مقام پر تخلیقی شعلہ روشن اور گرم نظر آتا ہے۔ جو ان کے گہرے مطالعے، مشاہدے، تجربے اور طویل ریاضت کے شاہد ہیں۔ فی الوقت میں صرف تسلیم نیازی کی غزل گوئی پر اپنی نگاہ مرتکز کرنے کی کوشش کر رہا ہوں ۔تا کہ ان کی غزلوں کے انفرادو امتیاز جو ہنوز پردۂ خفا میں ہیں، ان تک رسائی حاصل ہو سکے اور ہمارے ناقدین نے تسلیم نیازی کی جانب سے جو بے اعتنائی برتی ہے اس کا بھی ازالہ ہو سکے ۔

تازہ کار شاعروں میں جن شعرا نے اپنی غزلوں کے آہنگ ورنگ اور تب وتاب سے بصیرت افروز تازگی اور ندرت کا احساس دلایا ہے ان میں ایک اہم نام تسلیم نیازی کا بھی ہے ۔ اپنی تخلیقی توانائی اور تخلیقی اظہار کے حوالے سے یہ چونکاتے ہیں۔ان کی غزلوں میں پختگی، مضامین میں تنوع، ترکیبوں میں جستجو، خیالات میں رنگا رنگی لفظوں میں نیا ڈھنگ، شعری اظہارات میں طرحداری کا جو شعوری عمل پایا جاتا ہے وہ انہیں ایک ہوشمند، زبان شناس اور تہدار شاعر کے طور پر پیش کرتا ہے ۔انہوں نے خود آگہی کی روشنی میں سفر کر کے لفظوں کے پرانے سیاق وسباق اور نظام والتزام کے تحت نئے تجربوں کو دلکشی، تازگی، تمکنت اور توانائی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ زندگی کی رنگینی وسنگینی سے جو کشید ہوا ہے تسلیم نیازی نے انہیں غزل کے پیکر

میں جا بکدستی سے پیش کر دیا ہے۔ ''لہو شعر'' کی غزلوں میں کوئی ایسا صفحہ نہیں جسے روا روی میں پڑھا جائے ۔ ہر صفحے میں کوئی نہ کوئی شعر ایسا ضرور مل جاتا ہے جو دامن کش دل ہوتا ہے اور پڑھنے والا رک رک کر ٹھہر ٹھہر کر آگے بڑھتا ہے۔ بعض اشعار تو ایسے ہیں جو کسی اور ہی عالم میں پہنچا دیتے ہیں۔ آپ بھی اس میں شریک ہوں ۔

ممکن ہے کوئی وجہ تحیر نکل آئے
پھر شمر کے خیمے سے کوئی حر نکل آئے

تو خیر منا اے مری آنکھوں کے شناور
امڈا نہ کبھی سامنے تیرے یہ دو آبہ

رہائی ہاتھ نے دے دی تو پھینکا جال آنکھوں نے
قفس سے اڑ گیا طوطا تو روشن دان پر بیٹھا

تری گاڑی میں اے دنیا نشستیں سب کی خاطر تھیں
میں اک تنہا مسافر رہ گیا سامان پر بیٹھا

اس کی خنک مزاجئ ظاہر پہ تو نہ جا
بیٹھی ہے چھپ کے جھیل کی گہرائیوں میں آگ

وہ سراپا ناز ہے غیروں کا داعی ان دنوں
مجھ پہ تو نافذ ہے حکمِ امتناعی ان دنوں

پلکوں پہ جگنوؤں کا تقرر نہیں تو کیا
آنکھوں میں تیرگی سے تعصب ضرور ہو

تو دور ہے تو دل پہ ہے قابض ترا خیال
جاتا نہیں ہے چھوڑ کے یہ جن کسی طرح

یہ سارے مقتبس اشعار متنوع ہیں اور اظہار کا طریقہ امتیاز سے خالی نہیں۔لفظوں کو برتنے کی جدت وندرت کے ساتھ ساتھ ترکیب سازی کی بھی عمدہ مثالیں ان اشعار میں ملتی ہیں۔کہیں گراں باری نہیں، ژولیدگی نہیں، ترسیل کا المیہ نہیں، بلکہ صرف ونحو کے سارے آداب کا التزام، فکری وفنی روایات کا احترام اور فنکاری وہنرمندی کا احساس ہر قدم پر ہوتا ہے۔ساتھ ہی الفاظ میں ایک خاص طرح کی غنائیت اور تخیل کی کرشمہ سازی تسلیم نیازی کے شعری کائنات کے حسن میں اضافے کا سبب بنتی ہے، قاری کو سرشار کرتی ہے اور ہمارے ادراک واحساس سے رشتہ بھی قائم کرتی ہے۔

پڑھی نہ تھی تو محبت تھی "اردو کی پہلی"
مگر میں پڑھنے لگا ہوں تو یہ لغت ہوئی ہے

باغِ دل میں درخت کٹ رہے ہیں
دن پرندوں کے سخت کٹ رہے ہیں

ساری دنیا تو پھول پھل رہی ہے
ہم ترے نیک بخت کٹ رہے ہیں

سائباں نہیں ہے کیا
آسماں نہیں ہے کیا
جی خراب رہتا ہے
تو یہاں نہیں ہے کیا

آنکھ بے نور بھی نہیں مرشد
کوئی منظور بھی نہیں مرشد
اُس سے ملنا بھی سخت مشکل ہے
اور وہ دور بھی نہیں مرشد

خوشبو مرے مشام کے حصے میں آگئی
رنگوں کو اُس نے اپنے سراپے میں رکھ لیا

اُس ایک شخص سے ملنا ملانا ختم ہوا
اب آسماں پہ میرا آنا جانا ختم ہوا
میں اپنے آپ میں کم بھی نہ تھا مگر خود کو
کسی پہ اِتنا لٹایا، خزانہ ختم ہوا

زمانہ تھا تو ترا ساتھ بھی میسر تھا
ہوا نہیں ہے تو اک چراغ بھی نہیں ہے
مجھے پتا ہے میں اب تجھ میں اک ذرا بھی نہیں
یہ زخم ایسا بھرا ہے کہ داغ بھی نہیں ہے

تسلیم نیازی نے اپنی غزلوں کے لیے مواد عام زندگی اور گرد و پیش سے حاصل کیا ہے۔ اس لئے ان کی غزلوں کو بھی اپنے عہد، اپنے ہم عصروں اور اپنے پیش رووں سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کے درد و داغ، شکست و ریخت، سوز و ساز، لطف و مسرت، خلوص و ہمدردی، جبر و قہر، بے سمتی و بے تعلقی ایک ہی جیسے ہیں۔ لیکن وہ اپنے سلوک، اپنے لفظیات، اپنے طرز اظہار، اپنے اسالیب اور اپنے ترجیحات کے سبب ایک دوسرے سے الگ بھی ہیں اور قریب بھی۔ تسلیم نیازی نے اپنے پیش رووں اور ہم عصروں سے جو کچھ بھی سیکھا ہے اس میں سب سے نمایاں یہ رہا ہے کہ انہوں نے اپنی باتیں اپنے طور پر اپنے لب و لہجہ میں اور اپنے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں کہی ہیں۔ جس سے ان کے اشعار نئے آفاق، نئے معنی و آہنگ اور روشن ابعاد سے تعارف کا سبب بنتے ہیں۔

تسلیم نیازی کی غزلیں ان کی انفرادی سوچ اور فکر کی غماز ہیں اور ان میں انفرادیت کی شان بے نیازی بھی نمایاں ہے۔ ذاتی آلام و کوائف سے لے کر آفاقی رخوں کی تعبیرات اور گھر آنگن سے لے کر عالمی ناہموار منظر نامے کی تفسیرات پر بھی ان کی نظریں جمی ہوئی ہیں۔ لیکن انضباط و تحمل جو ان کی سرشت کا خاصہ ہیں انہیں ادعائیت کے قریب جانے نہیں دیتی ہیں۔ پھر بھی زندگی کے تب و تاب، اندرون کی تپش، معاشرے کی دھند، واقعاتی پرچھائیاں سب کے سب ان کے قلبی واردات کا جزو بنتے ہیں اور اپنی جھلک دکھائے بغیر نہیں رہتے ہیں۔ اسلوب و اظہار کی یہ خوبی انہیں زمان و مکان سے ماورا کر کے آفاقیت سے قریب کر دیتی ہے۔ ان کی غزلوں کے بالاستیعاب مطالعہ و محاسبہ سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ انہوں نے اپنی نگاہوں کو سامنے پھیلے ہوئے مناظر تک محدود نہیں رکھا ہے بلکہ کائنات بسیط کے دیدہ و نادیدہ پہلوؤں کو بھی اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ ان کی غزلوں میں زندگی کی قدروں کی پاسداری بھی ہے، ماضی کی جستجو بھی ہے اور مستقبل کے امکانات کی تلاش بھی۔ ان کا لب و لہجہ کسی سے مستعار نہیں۔ وہ غزل کے مزاج داں بھی ہیں اور قدرداں بھی۔ اسی لیے ان کی غزلیں روح سے ہم کلام بھی ہوتی ہیں، تارِ دل کو چھیڑتی بھی ہیں اور ان سے نکلی آواز کو بربطِ ہستی سے ہم آغوش و ہم کلام بھی کرتی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کریں کہ زندگی کی تفسیر کس طرح بیان کی گئی ہے۔

کس احتیاط سے وہ جنگ میں شریک ہوا
کماں تو دیدی غنیموں کو اور تیر مجھے

میرے اتر آنے کا اثر دِکھنے لگا ہے
احباب کی کشتی میں بھنور دِکھنے لگا ہے

چند کانٹے تو مرے دل میں نمو پا رہے ہیں
انہیں اِس باغ میں آرام ہے، کیا کیجیے گا

تمہاری زلف سے نکلے تو غم بدوش ہوئے
نہ کچھ زیاں ہی ہُوا ہے نہ کچھ بچت ہوئی ہے

رنگ و بو کو مرا معمول سمجھنے لگے ہیں
زخم کو مور و مگس پھول سمجھنے لگے ہیں

توڑ لوں اُس کو اگر سامنے دنیا نہیں آئے
میری انگلی تو اسی خار پہ رک جاتی ہے

بس ترے دھیان میں جانے کی ضرورت ہے مجھے
کاغذی پھول بھی مہکار تک آجائے گا

جو ایسا ہے تو زمانے، بس اب خدا حافظ
ترے یہاں سے مرا آب و دانہ ختم ہُوا

تسلیم نیازی نے جہاں غزل کا خوش رنگ جہان سجایا ہے اور غزل کو نئی جہات و آفاق سے آشنا کیا ہے وہیں معانی و مفاہیم کی ایک کائنات بھی آباد کی ہے کہ ہر پڑھنے والا اپنے طور پر ان سے حظ اٹھائے اور مفہوم کی کوئی نئی جہت متعین کرے۔ میں اپنی بات تسلیم نیازی کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں۔

سبھی تو خود کو سمجھتے ہیں آشنائے غزل
سو کس کو ٹال دے کس کو گلے لگائے غزل

تسلیم نیازی......سخن کا رمیز

سلیم سرفراز

فدایانِ شعر و سخن کے لئے ۲۰۱۲ء اس لحاظ سے بھی یادگار رہا کہ اسی سال جواں سال معتبر شاعر کا دیوان "لہو شعر" منصہ شہود پر آیا اور قدرے خاموش پڑی شاہراہِ ادب کو نغمہ بار کر گیا۔ یوں تو ہر ہفتہ ہی کوئی نہ کوئی شعری مجموعہ قارئینِ شعر و ادب کے صبر و ضبط کا امتحان لینے کے لئے وارد ہو جاتا ہے۔ جس پر وہ پیشہ ور مضمون نگار جو شاعری کے ابجد سے بھی واقف نہیں، تعریف و توصیف پر مبنی اپنے عامیانہ مضمون سے قارئین کو گمراہ کرتے ہوئے صاحبِ مجموعہ سے خراجِ تشکر وصولتے رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں جب کوئی مجموعہ ہوا کے خوش گوار جھونکے کی طرح ذہن و دل کو تر و تازہ کر دے تو ایسے شاعر کی پذیرائی کارِ ثواب کے مترادف ہو جاتی ہے۔ بلاشبہ تسلیم نیازی کا دیوان (لہو شعر) سنجیدہ اور باذوق قاری کے لئے کسی گرانمایہ تحفے سے کم نہیں۔ اس مجموعۂ کلام کا اختصاص یہ ہے کہ اس میں معیاری شاعری کے وہ تمام اوصاف اور تغزل کے وہ تمام رنگ جن سے بڑی شاعری وجود میں آتی ہے، قابلِ رشک فنی لوازمات کے ساتھ موجود ہیں۔ ان کی نسل کے شعرا میں معدودے چند ہی ہوں گے جن کے اندر فکر و فن کی ایسی زرخیزی اور بوقلمونی مبدۂ فیض کی جانب سے ودیعت ہوئی ہو۔ اس دیوان کے مرتب جلال کا کوی صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ ان کی نکتہ شناس نگاہوں نے نہ صرف یہ کہ اس گوہرِ گم گشتہ (تسلیم نیازی) کی بازیافت کی بلکہ ان کے دیوان کی طباعت سے اشاعت تک کی تمام تر حوصلہ طلب ذمہ داریاں اپنے سر لے لیں۔

دو دہائی قبل تسلیم نیازی کا اولین شعری مجموعہ "ڈالفن" منظرِ عام پر آ کر اپنی خوشبو بکھیر چکا تھا۔ مشاہیرِ ادب نے اس مجموعے کی خوب خوب پذیرائی کی تھی اور انہیں نئے امکانات کا اہم اور تازہ کار شاعر قرار دیا تھا۔ اس دیوان میں شامل ان کی آرا سے ثابت ہے کہ

انہیں تسلیم نیازی کی فنی صلاحیت اور فکری بلوغت نے ازحد متاثر کیا تھا۔ واضح ہو کہ یہ تمام آراً برسوں قبل ان کے شعری مجموعے ڈالفن کی روشنی میں دی گئی تھیں جوان کی پہلی کاوش تھی۔ جبکہ زیرِ نظر دیوان کو ان کا شاہکار قرار دیا جاسکتا ہے۔ پہلے مجموعے کی بہ نسبت اس دیوان میں فنی وفکری سطح پر غضب کی ہمواری اور ثابت قدمی موجود ہے۔ جس سے منعکس ہوتا ہے کہ طویل درمیانی عرصے میں انہوں نے اپنے شعری سفر کے لئے وہ راہِ شجر دار تلاش کرلی ہے جو ہمارے عظیم کلاسیکل شعراً کے دیار چوم کر آتی ہے۔ انہوں نے قدیم وراثت کی پختہ زمین پر اپنی شاعری کی شاندار عمارت تعمیر کی ہے اور اسے اپنی فنکارانہ ہنرمندی سے بالکل نیا Look دے دیا ہے۔ روایت اور جدت کے خوبصورت امتزاج سے انہوں نے اسطرح اپنے شعری ایوان سجائے ہیں کہ کہیں سے قدامت کی گرد اور جمود کا شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ دونوں کناروں کی منتخب خوبیاں ان کے اشعار میں ایسی باہم شیر و شکر ہوگئی ہیں کہ دو آتشہ کا مزہ ملتا ہے۔ کلاسیکل رچاؤ سے معمور اور تغزل سے بھرپور یہ اشعار ملاحظہ ہوں......

آنکھ تو رونقِ بازار پہ رک جاتی ہے
بات تو درہم و دینار پہ رک جاتی ہے

کچھ تو ہے گردشِ ایام سے رشتہ اُس کا
ورنہ یہ کیوں میرے اصرار پہ رک جاتی ہے

تم اگر ناقۂ دل پر نہ سواری کرتے
ہم بھی صحرا میں کہیں وقت گزاری کرتے

لہو ہوس کا رگوں میں لگا ہے جمنے، غلط
بھلا دیا ہو اُسے لمحہ بھر کو ہم نے، غلط

گلشن کی سیاست سے پریشاں ہیں پرندے
کہتے ہیں کہ اچھی تھی صعوبت ہی قفس کی

رنگ و بو کو مرا معمول سمجھنے لگے ہیں
زخم کو مور و مگس پھول سمجھنے لگے ہیں

یہ قلم جوشِ بلاغت میں جہاں تک پہنچے
گھوم کر پھر لب و رخسار تک آ جائے گا

اندھیرے کرتے ہیں خانہ تلاشی
تجھے رکھوں کہاں اے پُرِ تماشی

تم بھی آخر سفر سے اوب گئے
ہم بھی اے ہم رکاب تھک چکے ہیں

ساری دنیا ہے تازہ دم اب بھی
ہم ہی خانہ خراب تھک چکے ہیں

اپنی موجوں پہ ناز ہے اُس کو
ہم اُسے پار کر کے دم لیں گے

دِل کو مسجد بنا رہے ہو میاں
لوگ مسمار کر کے دم لیں گے

کیا غضب کا رنگِ تغزل اور پیرایۂ اظہار کی آب وتاب ہے۔

تمام مانوس لفظیات وتراکیب کے باوجود انہوں نے اپنے فطری جوہر اور مشقِ سخن کو بروئے کار لاتے ہوئے ہر شعر کو ایک جدید اور خوشنما پیرہن عطا کر دیا ہے۔ان اشعار میں ایسی فصاحت وسلاست ہے، جیسے موجہ بہار رخسارِ گل کو چھوتا ہوا سبک خرامی سے گزر رہا ہو۔اشعار کی نغمگی اور روانی سے عیاں ہے کہ تسلیم نیازی کی طبیعت کو موزونیت اور موسیقیت سے گہری نسبت ہے اور وہ الفاظ کے بطون سے واقف ہیں۔لہٰذا جب وہ کہتے ہیں......

جس دم کہ دیکھتے ہیں مجھے مائلِ سخن
کرتے ہیں دست بستہ مرا انتظار لفظ

تو مبالغہ نہیں لگتا۔وہ الفاظ کے رمز شناس ہیں۔وہ الفاظ کو اوزان وبحور کی ضرورت کے مطابق

کھپاتے نہیں بلکہ اشعار میں نگینے کی طرح جڑتے ہیں۔اس دور کے سب سے بڑے غزل گو عرفان صدیقی نے ایک انٹرویو میں فرمایا تھا،''میں ایک ایک لفظ کے استعمال پر ہفتوں سوچتا ہوں ،ہفتوں بلا مبالغہ۔یہ کوئی بڑی چیز نہیں ہے کہ اور ایسا نہیں کر سکتے اور کرتے بھی ہونگے لیکن میں سوچتا ہوں کہ لفظ کے جتنے امکانات ہیں انہیں تلاش کر لوں اور برت سکوں۔اس لئے خاصی محنت وریاضت کی ضرورت پڑتی ہے۔''یقیناً تسلیم نیازی بھی اس عمل سے گزرتے ہوں گے کیونکہ الفاظ کے مکمل عرفان اور پہچان کے بغیر ایسی اچھی اور سچی شاعری وجود میں آ ہی نہیں سکتی۔انہوں نے اعلیٰ شعری روایتوں کی پاسداری کرتے ہوئے فنی ولسانی ہر دو سطح پر بے حد محتاط اور سنجیدہ رویہ اختیار کیا ہے۔موضوعات میں تنوع کے ساتھ زبان وبیان کی چستی، برجستگی، شگفتگی، لب ولہجہ کی انفرادیت وشفافیت، مافی الضمیر کی سہل ترسیلیت اور قدرتی خلاقیت نے ان کی شاعری کو اثر انگیز اور معنی خیز بنانے میں اہم کردار نبھائے ہیں۔غزل میں دو ایک اچھا شعر بلکہ اعلیٰ شعر اوسط درجے کے شاعروں پر بھی اتر آتا ہے۔لیکن ایسے اشعار کی قابلِ قدر تعداد ہی شاعر کو دیگر سے ممتاز کرتی ہے اور انفرادی تشخص کے ساتھ دربارِ شعر وسخن میں مسندِ وقار واعتبار بخشتی ہے۔تسلیم نیازی اس معیار پر بلا شبہ کھرے اترتے ہیں۔چند خوبصورت اشعار ملاحظہ ہوں......

یونہی جینا محال ہو گیا ہے
بے خبر ایک سال ہو گیا ہے

پی ہوس آج کل اکیلی ہیں
عشق جی کا وصال ہو گیا ہے

مچھلیاں اب کہاں قیام کریں
سارا پانی ہی جال ہو گیا ہے

اُس ایک شخص سے مِلنا مِلانا ختم ہُوا
اب آسماں پہ مرا آنا جانا ختم ہُوا

جو ایسا ہے تو زمانے، بس اب خدا حافظ
ترے یہاں سے مرا آب ودانہ ختم ہُوا

مٹی فقیر کی، مرا گارا فقیر کا
میں کیا مرا تو سارے کا سارا فقیر کا

کچھ رنج بچ رہے تھے تو سہنے کے واسطے
مجھ میں ہُوا نزول دوبارہ فقیر کا

تفتیش کر رہے ہیں جنابِ فقیہِ شہر
کس طور ہو رہا ہے گزارہ فقیر کا

بس ترے دھیان میں جانے کی ضرورت ہے مجھے
کاغذی پھول بھی مہکار تک آجائے گا

سرِحدِ ضبط سے نکلے تو ذرہ عرصۂ ہجر
لفظ خود نقطۂ اظہار تک آ جائے گا

اردوشعروادب سے جن کی دیرینہ وابستگی رہی ہواورجنھوں نے جدید شعراُ کے ساتھ اساتذہ کے کلام کا بھی بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا ہواوران کی لطافت وبلاغت سے اپنی روح کو متعارف کرایا ہووہی باذوق اہلِ علم حضرات ایسے اشعار کی قدر وقیمت کا صحیح تخمینہ لگا سکتے ہیں۔ان محولہ بالا اشعار کی قرأت سے بخوبی آشکار ہوجاتا ہے کہ درونِ شاعر تخلیقی جوہر کا ایک پُرشور دریا موجزن ہے اوراس پر مستزاد ساحل کی طرح شاعر کا تنقیدی شعوراس پر ایسی گرفت رکھتا ہے کہ موجِ تخلیقیت کو بیکنار ہونے نہیں دیتا۔ان کی شاعری روشن پہلو،انفرادی واجتماعی تجربات اوران کےبطن سے پیدا ہونے والی مختلف انسانی کیفیت واحساس کا خالص جمالیاتی اظہار ہے اوران کا بڑا وصف ان کا شعری اسلوب ہے جس میں بے حد تازگی اور مقناطیسی کشش ہے۔الفاظ کے انتخاب،اچھوتی تراکیب اورخوش رنگ تشبیہات سے سخن کوآراستہ کرنے کی شعوری کوشش ان کے اسلوب کو جاذبیت اورانفرادیت بخشتی ہے۔

الفاظ وموضوعات کے ذخائر تو کم وبیش ہر شاعر کے پاس ہوتے ہیں۔لیکن سیپ سے گہر نکالنے کا ہنر ہرایک کے پاس نہیں ہوتا۔ایک ذرا الفاظ کی دروبست کی نادرستی اور پیرایۂ اظہار کی تھوڑی سی بدنیتی نادر موضوعات کو بھی بےکشش بنا دیتی ہے۔غزل کی قدر وقیمت کا

تعین صرف موضوع اور مواد کی بنا پر نہیں ہوتا۔ اس کی ہیئت اور تکنیک ہی اسے اعلیٰ اور ادنیٰ بناتی ہے۔ اس تناظر میں تسلیم نیازی کے دیوان کا مطالعہ یک گونہ اطمینان اور فرحت کا احساس دیتا ہے۔ ہر چند کہ روایتی محبوبیت، جنون وخرد، وضع داری و بردباری، عشق وہوس، انا وخودداری اور شاہی و درویشی جیسے موضوعات سے ان کی شاعری نمو پاتی ہے۔ لیکن لب ولہجہ کی تازہ کاری، الفاظ کی خلاقانہ تزئین کاری اور استعاروں اور تشبیہوں کی خوش سلیقگی سے ان کی شاعری کو جداگانہ اور فنکارانہ شناخت ملتی ہے۔ درج ذیل اشعار ملاحظہ ہوں جن کے موضوعات تو عام قسم کے ہیں لیکن قدرتِ کلام اور فنی ہنرمندی نے انہیں کس طرح بلند وبالا بنا دیا ہے۔

ہیں فقیری میں سو حسرت پہ ہی کافی ہوئے ہیں
بادشہ ہوتے تو فرمان نہ جاری کرتے

لگا رکھا ہے چہرے پر تبسم
اداسی آنہ ٹپکے گھر ہمارے
غمِ جاناں ہی ہم کو وجہِ خواری
یہی اسبابِ کروفر ہمارے

صبر کے پھل ہنوز ہیں کچے
زخم ابھی خونچکاں نہیں ہوئے ہیں

شاعری کے لوازمات میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ طرزِ بیان میں شعریت اور حلاوت ہو۔ درونِ خانۂ دل کا مشکل سفر ہو یا نیرنگیٔ زمانہ پر نظر ہو، اتنا تو طے ہے کہ اگر اس میں وارداتِ حسن وعشق کے اجالے نہ ہوں تو شاعری دلوں کو منور نہیں کر سکتی۔ کوئی ضروری نہیں کہ اس کا اظہار براہِ راست ہی ہو لیکن شاعر کے جذبات حسن وعشق کی سلگتی بارش میں بھیگے ہوئے ضرور ہوں۔ تسلیم نیازی غمِ دوراں سے مخاطب ہوں یا غمِ جاناں سے، ان کے دلِ گداختہ میں جو حسرت ویاس کی کیفیت ہے اس سے مفر نہیں۔ ان کی حیات پر دردوغم کے بادل ہمیشہ چھائے رہے۔ ایک طرف دل کے آزار تو دوسری طرف غمِ روزگار اور ان دو دلدلی کناروں میں قید ان کا مضطرب اور پرشور وجود۔ ایسے میں وہ شعر نہ کہیں تو سینہ ہی پھٹ جائے۔

غُل کرنے سے روکو نہ اسیرانِ قفس کو
رکھیں گے زباں بند تو پھٹ جائیں گے سینے

شق ہُوا جاتا ہے مرا سینہ
اب مجھے اذنِ لب کشائی دے

صیاد کی راحت میں خلل ڈالتے رہیو
کچھو نہ کبھی سلسلۂ آہ و بکا بند

شاعری ان کا مشغلہ نہیں بلکہ زندگی کا لازمی جز ہے۔ اپنے دردوکرب کے اظہار کے لئے ان کے

پاس یہی بہتر وسیلہ ہے۔جسے قدرت نے انہیں بطورِ خاص بخشا ہے۔انہیں گہرا احساس ہے کہ غمِ روزگار کی تگ ودو کے باعث وہ مقام اور وقار انہیں حاصل نہ ہو سکا جس کے وہ بہر طور مستحق تھے۔یہ احساس اُس وقت دوچند ہو جاتا ہے جب وہ نا اہلوں کو منصبِ عزت وتوقیر پر فائز دیکھتے ہیں۔اِس محرومی وحق تلفی کا اظہار اُن کی شاعری میں اِس طرح ہوتا ہے۔

سب کو منزل کی بشارت، مجھکو بس اذنِ سفر
سب کی قسمت آبجو، میرا مقدر العطش

پھر اکی بار بھی پی لی شراب جس تس نے
اور آپ نے یونہی دامن بھگولیا صاحب

اوروں کو دودھ کی دھلی تھیلی کی تھیلی دھوپ
میرے لئے بس اتنی سی میلی کچیلی دھوپ

ابکے بھی التفات کا موسم تھا حسبِ ذیل
اُن کو ملی شراب، اِدھر آئی تشنگی

میں کس درجے کا ہوں مے خوار یہ ہو جائے طے ساقی
نہیں تو آج سے تجھکو مبارک تیری مے ساقی

اکثر وبیشتر اپنی تہی دستی وخستہ حالی کے لئے وہ آسمان کو ذمہ دار مانتے ہیں۔اِس حقیقت سے قطعِ نظر کہ منصب ومرتبہ اور مال ومتاع حاصل کرنے کے لئے فی زمانہ جن صفات کی ضرورت ہوتی ہے اُن سے وہ عاری ہیں۔اُن کے اِس شاعرانہ اظہار سے محظوظ ہوں......

یہ درد وغم میں بتاؤں کہاں سے آرہے ہیں
یہ خورد ونوش مجھے آسماں سے آرہے ہیں

ٹھہر اے گردشِ ایام دم تو لینے دے
ابھی ابھی تو ہم اک امتحاں سے آرہے ہیں

اٹھیں اگر زمیں سے تو سہنا بھی سہل ہو
اتریں جو آسماں سے مسائل تو کیا کروں

لیکن یہ قنوطی اور شکایتی لب ولہجہ تا دیر نہیں رہتا۔جلد ہی اُن کی انا اور خودداری اِس پر قدغن لگاتی ہے اور پھر پورے طمطراق اور خوداعتمادی کے ساتھ اُن سے ایسے اشعار تخلیق کرواتی ہے جن سے ان کی شخصیت کے اصل پہلو نمایاں ہوتے ہیں......

موجود ہوں تمام وسائل تو کیا کروں
میں خود ہوں اپنی راہ میں حائل تو کیا کروں

طبیعت جرم پر آتی نہیں تسلیم
وگرنہ کون جرمانے سے ڈرتا ہے

اُن کو جو حق بیان سیاہی سے ہے گریز
مجھکو بھی ایسے ظلِ الٰہی سے ہے گریز

اس دیوان کی کائنات کے بڑے رقبے پر ایک کیف آور جمالیاتی رنگ بکھرا پڑا ہے جس سے ایک دلآویز صورت جھانکتی سی نظر آتی ہے۔ان کی شاعری میں جابجا ایسے اشارے بھی ملتے ہیں جن سے آشکار ہوتا ہے کہ برسوں پرانے کسی عشق کی تجدید ان کی شاعری میں نئے اور پُرکشش رنگ بھرنے میں معاون و متحرک ہوئی ہے۔اس وارداتِ قلبی کے اعادے نے ایک سرشاری اور مخموری کی کیفیت پیدا کر کے ان کے لہجے کو ایک انوکھی کھنک اور اچھوتی کسک سے آشنا کر دیا ہے۔پہلے اس وارداتِ حسن و عشق کی خبر دینے والے یہ لطیف اشارے ملاحظہ فرمائیں......

جب تیز تھا بہاؤ تو بہہ تک نہیں گئے
ہم تجھکو ڈھونڈنے تری تہہ تک نہیں گئے

قریب اُس کے ہوئے بھی نہ تھے کہ دور ہوئے
جہاں گئے بھی نہ تھے ہم وہاں سے آ رہے ہیں

ہوا قریب سے گزری تو لَو مچلنے لگی
کسی کو دوستو، اس حال میں شکیب کہاں

اور پھر یہ غزل جس کا ہر شعر تجدیدِ عشق کی تصدیق کرتا نظر آتا ہے......

کھوئے تو پھر وہ آئے نظر بیس سال بعد
پھلنے لگا وفا کا شجر بیس سال بعد

اِس حسنِ اتفاق کے قربان جایئے
ہم اُن کو یاد آئے مگر بیس سال بعد

اسی غزل کا یہ شعر تو ان کے محبوب کی وطنیت تک کا پتہ دے جاتا ہے......

بنگال کا ہے حسن تمسخر نہ جانیئے
مجھ پر کیا ہے اس نے اثر بیس سال بعد

معاملاتِ عشق اور جمالیاتی حسن کی لافانی حکایات بیان کرتے ہوئے یہ اشعار جن کے متعلق گمانِ غالب ہے کہ اسی مذکورہ وارداتِ قلبی کے زیرِ اثر کہے گئے ہیں......

جب سے اُس چشمِ نشہ گر کا ارادہ ہُوا ہے
لقمۂ نانِ جوئیں جرعۂ بادہ ہُوا ہے
دل کو اِس خاکِ بدن پر ترس آتا ہی نہیں
اک جواں درد کا پیری میں اعادہ ہُوا ہے

عشق وہ لافانی جذبہ ہے جس کی طرف انسان روزِ ازل سے ہی مائل رہا ہے۔میرؔ نے اپنی آپ بیتی میں اپنے والد علی متقی کے بارے میں لکھا ہے--"وہ روز و شب خدا کی یاد میں رہتے تھے۔خدا نے کبھی انہیں شرمندہ نہیں کیا۔کبھی وہ موج میں آتے تو فرماتے، 'بیٹا عشق کرو۔عشق ہی اس کارخانے میں متصرف ہے۔اگر عشق نہ ہوتا تو نظمِ کل قائم نہیں رہ سکتا تھا۔بے عشق زندگی وبال ہے۔عشق میں جان کی بازی لگا دینا کمال ہے۔عشق بناتا ہے۔عشق ہی کندن کرتا ہے۔دنیا میں جو کچھ ہے عشق کا ظہور ہے۔'"

میرؔ کی تمام شاعری اسی عشق کی تفسیر ہے۔عشق حقیقی ہو یا مجازی ہر ایک کا قبلہ و قطب ایک ہی رہا ہے۔زندہ انسان کا عشق زندہ جسم سے ہوتا ہے۔جسموں کے اتصال سے ہی عشق درجہ کمال تک پہنچتا ہے۔تصوف کا بھی یہی تصور ہے کہ 'رجولیت' کے بغیر عشق ممکن نہیں۔تسلیم نیازی بھی عشق کے اسی زندہ اور تابندہ نظریے کے قائل ہیں۔وہ حسن کے پرستار ہی نہیں طلبگار بھی ہیں۔وصلِ یار کے وہ فقط خواب ہی نہیں دیکھتے بلکہ وہ اس سے لذت کشید کرتے ہیں جو دل کو تازہ کار اور ذہن کو بیدار کرتی ہے......

تمہاری زلف سے نکلے تو غم بدوش ہوئے
نہ کچھ زیاں ہی ہُوا ہے نہ کچھ بچت ہوئی ہے

گناہِ عشق میں جاں بچ گئی تو دل سے گئے
اگر قصاص سے چھوٹے ہیں تو دِیَت ہوئی ہے

اُس کے غم سے دست برداری، نہیں
جنگ میں نے اِتنی بھی ہاری نہیں

ایسا بھی نہیں کہ وہ صرف حسن و عشق کے ہی قابلِ رشک مغنی ہیں۔ان کے اشعار میں زمانے کے نشیب و فراز، زندگی کی شکست و ریخت، سیاست کی پستی و درندگی۔دنیا کے ظلم و جبر اور قوموں کے عروج و زوال کی عکاسی بھی بھرپور اور موثر ڈھنگ سے ہوتی ہے......

بھیگے ہیں، کسی روز تو سوکھیں گے پر و بال
اے عاجزِ پرواز، تردد نہیں کرتے

اگر تھک جائیں نوحہ گر ہمارے
تو بول اٹھیں علی اصغر ہمارے

ساری دنیا تو پھول پھل رہی ہے
ہم ترے نیک بخت کٹ رہے ہیں

کہیں بھی جبر، کہیں زور ہے، نہیں ہے نا
کوئی صدا ہے، کوئی شور ہے ہے، نہیں ہے نا

لگے ہوئے ہیں سبھی قوم کی قیادت میں
کوئی لٹیرا، کوئی چور ہے، نہیں ہے نا

ہم نہ موتی میں نہ مرجان میں رکھے ہوئے ہیں
ہم تو پاسنگ ہیں میزان میں رکھے ہوئے ہیں

غرض کہ روداد دل ہویا کہ دنیا ہر دو محاذ پر تسلیم نیازی نے اپنی دل پذیر شاعری کے وہ جوہر دکھائے ہیں جو انہیں فدایانِ غزل کی بھیڑ میں سرخرو کرتے ہیں اور ان کے اس قول کی نفی کرتے ہیں۔

فدایانِ غزل کی بھیڑ ہر سو
اور اُس پہ میں بھی اک بارِ اضافی

میں احتسابِ غمِ روز و شب میں ہوں مصروف
نہ میں رسولِ غزل ہوں نہ میں خدائے غزل

آخر میں مشاعرہ بازوں کے ذریعہ ایک بالکل پامال موضوع پر ان کا ایک شعر ملاحظہ ہو......

سامانِ سفر تم نے تو چن چن کے لیا باندھ
کونے میں پڑی تھی جو دعا، لی کہ نہیں لی

کس فنی مہارت کے ساتھ اس مضمون کو انہوں نے اپنے شعر میں برتا ہے کہ اس کی تقدیس و پردگی بھی برقرار رہی اور رمز و کنایہ سے گہرائی و گیرائی بھی پیدا ہوگئی۔شاعری اسی ہنر کا نام ہے

جس کے بارے میں وہ خود فرماتے ہیں......

یونہی نہیں ہے تسلیم نیازی کی تو اک عمر
مٹی میں مِلی ہے تو ہنر دِکھنے لگا ہے

آج پھر میرے کاندھوں پہ سر اُگ گیا
سر پہ لمبا، انا کا شجر اُگ گیا

یہی انا کا شجر تسلیم نیازی کی مکمل شخصیت پر سایہ فگن ہے اور ان کے لہولہو وجود کو توانائی اور طمانیت بخشتا ہے ۔اکثر ایسا لگا کہ تیز و تند آندھیوں میں یہ شجر اپنی جڑ سے اکھڑ جائے گا۔لیکن قوتِ باطنی اور خود اعتمادی کے مضبوط کاندھوں نے آگے بڑھ کر اسے سنبھالا دیا ۔انا ان کی ذات کا کتنا اہم جزو ہے یہ ان کے انتساب کے الفاظ سے عیاں ہے۔جس میں پہلے حرف الف سے انہوں نے اللہ، اماں، ابا کے علاوہ انا کو بھی پہچانا ۔اس شجر کی جڑیں ان کے وجود میں کس گہرائی تک پیوست ہے اس کا اندازہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کے فن سے پہلے ان کی ذات کا جائزہ لیا جائے۔جب تسلیم نیازی نے اس وسیع و عریض کائنات کو دیکھنے کے لئے اپنے شعور کی آنکھیں کھولیں تو پہلے ہی منظر نے ان کے دل و دماغ کی کچی دیواروں کو ہلا کر رکھ دیا۔ان کے والد اپنی یادداشت کھو کر عالمِ خود فراموشی میں بسترِ علالت پر تھے۔والد کی قربت حاصل ہونے کے باوجود ان کی آنکھوں میں اپنے لئے اجنبیت اور بیگانگی کا عکس دیکھنا ایک کم سن بچے کے ذہن کی نو زائیدہ لہروں کو کس طرح مضطرب کرتا ہوگا،اس کی عکاسی سطح کاغذ پر ممکن نہیں ۔افرادِ خانہ میں علیل والد کے علاوہ صرف والدہ اور ایک بڑی ہمشیرہ موجود تھیں۔تقریباً پانچ سال صاحب فراش رہنے کے بعد والد نے داعئ اجل کو لبیک کہا اور اس طرح پہچان کا آخری نشان بھی تاریکی کے دبیز پردے میں چھپ گیا۔آٹھ نو سال کا معصوم بچہ اپنی حیرت زدہ اور افسردہ نگاہوں

میں ڈھیر سارے سوالات لئے آسمان کی جانب دیکھتا رہ گیا۔لیکن اس بچے کے قدموں تلے کی زمین کھسک گئی۔خود کو اس طرح بے سایہ اور غیر محفوظ پا کر فطری طور پر اس بچے نے کوشہ تنہائی میں پناہ لی اور اپنے لخت لخت وجود کو جوڑنے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔اس خاندان کی کفالت کی ذمہ داری ایک نیک اور رشتوں کے پاسدار خالہ زاد بھائی نے اپنے شانوں پر خوش اسلوبی اور فراخدلی سے اٹھالی تھی۔جب ہمشیرہ کی شادی ہوگئی تو سن بلوغیت کی طرف گامزن یہ بچہ اپنی والدہ کی انگلی پکڑے ہمشیرہ کے گھر آسنسول آگیا۔وہیں اس نوخیز خزاں گزیدہ کونپل کی آبیاری ہوئی۔اس نوخیز پودے نے نوجوانی کی سرسبز وادی میں قدم رکھا ہی تھا کے ایک حادثے کا شکار ہوگیا۔جان تو کسی طرح بچ گئی۔لیکن مہینوں ایک بستر پر ایک ہی کروٹ پڑے رہنا کسی عذاب سے کم نہ تھا۔اس عرصے میں تسلیم نیازی نے اپنے باطن کا سفر کیا۔اس سفر میں وہ ان راہوں سے گزرے جن سے وہ اب تک نا آشنا تھے اور انہیں اپنی صلاحیتوں اور ذہانتوں کے وہ جواہر ہاتھ لگے جو اب تک نظروں سے پوشیدہ تھے۔جس طرح بعض پھول مسلے جانے پر ہی خوشبو بکھیرتے ہیں،اسی طرح بعض شخصیتوں کی صلاحیتیں بھی ناسازگار اور ناموافق ماحول میں ہی اپنے جوہر دکھاتی ہیں۔ان پے در پے المناک سانحوں میں ایک عام آدمی شکست خوردہ ہو کر زندگی سے بیزار ہو جاتا۔لیکن روبصحت ہونے کے بعد تسلیم نیازی نے زمین پر قدم رکھا تو ان میں اس قدر توانائی اور ثابت قدمی تھی کہ فلک بھی محوِ حیرت تھا۔وائل عمری ہی سے جو سانحات اور حادثات ان کا تعاقب کر رہے تھے ان سب نے انہیں حد درجہ حساس اور خوددار بنا دیا۔جس انکو دیوارِ ذہن پر اگا ہوا خودرو پودا سمجھتے رہے،دیکھتے ہی دیکھتے وہ لمبا،انا کا شجر بن گیا۔یہ ان کی انانیت ہی تھی کہ شاعری سے جنون کی حد تک لگاؤ رکھنے کے باوجود کسی کے آگے زانوئے ادب تہہ نہیں کیا اور نہ ہی کسی کو اصلاح کار بنایا۔اپنی خداداد فہم وفراست اور روز وشب کی محنت اور بے شمار کتابوں کے مطالعے کے ذریعہ تسلیم نیازی نے اس فن میں مہارت حاصل کی اور بلاشبہ ایک ایسے پختہ شاعر بن کر ابھرے،جن کی فنِ عروض اور زبان وبیان پر کماحقہٗ گرفت تھی اور خود پر مکمل اعتماد بھی۔لیکن ان کی پارہ صفت طبیعت اسی پر مطمئین نہ ہوسکی۔ہندی زبان وادب سے تسلیم نیازی کی دیرینہ شناسائی ہے۔کیونکہ ان کی تعلیم بہار سے شروع ہوئی ہے۔علاوہ ازیں تسلیم

نیازی نے جدید انگریزی ادب سے رابطہ قائم کیا اور اس سے کافی استفادہ حاصل کیا۔بہت ہی کم وقفے میں ایک بالکل اجنبی زبان بنگلا سیکھی۔بنگلہ شعر وادب کا گہرا مطالعہ کیا اور پھر بنگلا زبان میں بھی کویتائیں لکھنا شروع کیں۔

اخیر میں تسلیم نیازی کا ایک مختصر تعارفی خاکہ پیشِ قارئین ہے۔

نام:- تسلیم نیازی

تاریخ پیدائش:- ۱۷ فروری ۱۹۶۶

جائے پیدائش:- موضع ویاؤ، ضلع نالندہ، بہار

تصانیف:- (۱) ڈالفن (شعری مجموعہ) م ۱۹۹۲

(۲) لہو شعر (دیوان) مطبوعہ ۲۰۱۲

(۳) جی خراب رہتا ہے (شعری مجموعہ)

تسلیم نیازی ..ایک تعصب گزیدہ شاعر

سلیم سرفراز

معراج احمد معراج (کلٹی) کا ایک مضمون بعنوان ''تسلیم نیازی فن کی کسوٹی پر'' نظر نواز ہوا۔ کچھ ہی دنوں قبل ایک مزاحیہ آرٹسٹ محفوظ انصاری پر ان کا ایک توصیفی مضمون شائع ہو چکا ہے۔ دونوں مضامین کے مطالعے سے معراج کی ترجیحات اور تعصبات کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ معراج احمد معراج تو خیر خود شاعر ہیں اور علم عروض پر بھی انہیں کچھ دسترس حاصل ہے ورنہ یہاں ایسے مضمون نگار بھی ہیں جو شاعری کے الف ب سے بھی نابلد ہیں لیکن شعری مجموعوں پر مضحکہ خیز مضامین کے انبار لگائے جا رہے ہیں۔ معراج احمد معراج کلٹی کے معروف شاعر ہیں اور انہیں پروفیسر عنوان چشتی کے شاگرد ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ ان کی دو تین کتابیں بھی منظر عام پر آچکی ہیں ہر چند کہ اس سب ڈویژن میں شائع ہونے والی بیشتر کتابوں کے متعلق ایک نکتہ شناس شخص کا قول ہے کہ اگر ان کتابوں کی اشاعت نہ ہوتی تو اردو زبان و ادب کو زیادہ فیض پہونچتا۔ معراج کی کتابوں پر بھی کم و بیش یہی قول صادق آتا ہے کہ سفارش اور رسوخ کی بدولت سرکاری اداروں سے انعامات حاصل کر لینا کتابوں کے معیار میں اضافے کا سبب نہیں بنتا۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ شاعر اگر تنقید کے قلم رو میں داخل ہوتا ہے تو بے سمتی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کا مضمون کسی ہمعصر شاعر پر مبنی ہو اور وہ اس سے ادبی قد و قامت میں اونچا ہو تو پھر یقینی طور پر اس کی تحریر میں تنقیص و تضحیک کا پہلو غالب آ جاتا ہے۔ کیونکہ لاشعوری طور پر وہ خود کو اس کا مقابل تصور کرتا ہے اور اسے خدشہ لگا رہتا ہے کہ اس کی بجا تعریف و توصیف اور فنی خوبیوں کا اعتراف کہیں اس کے اپنے ادبی قد کو مزید پست نہ کر دے۔ حالانکہ تسلیم نیازی اور معراج احمد معراج کے درمیان ادبی محاذ پر کسی مقابلہ آرائی کی قطعی گنجائش نہیں کہ ہم عصر ہونے کے سوا دونوں شاعروں میں کوئی قدر بھی مشترک نہیں۔ تسلیم نیازی خداداد صلاحیت کے مالک ایک فطری شاعر ہیں۔ جن کی ذہنی و علمی نشو و نما میں کسی نام نہاد استاد کا ہاتھ نہیں۔ موزونیت اور

موسیقیت ان کی رگ و پے میں پیوست ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ انہیں زبان و بیان اور عروض و بحر پر بھی خاصی قدرت حاصل ہے۔ جب کہ معراج نے کئی اساتذہ کے قیمتی مشوروں سے استفادہ حاصل کیا۔ اساتذہ نے جو اصول و ضوابط سکھائے ہیں انہیں کو معراج فن سمجھا ہے اور ان سے ایک قدم بھی آگے پیچھے ہونے کو وہ تیار نہیں۔ شاعری کو جزوِ پیغمبری اسی لئے کہا گیا ہے کہ یہ صلاحیت ودیعتِ الٰہی ہوتی ہے۔ محنت و مشق کے ذریعہ شاعری تو کی جا سکتی ہے۔ لیکن وہ آمد والی کیفیت پیدا نہیں ہو سکتی جو بڑی شاعری کی روح ہے۔ معراج خود اعتراف کرتے ہیں، ''......ظہیر غازی پوری، رونق نعیم، صابر اجمیری اور سلام جونپوری نے مجھے مفید مشوروں سے نوازا۔'' معراج کے بارے میں ان کے نام نہاد استاد عنوان چشتی کہتے ہیں، ''انہوں نے شعروں میں ہمیشہ معنویت کو فوقیت دی ہے اسی لئے اردو کے حروفِ علت کا سقوط گراں نہیں گزرتا۔ ان کے کچھ شعروں میں ایطا اور تعقید کے عیب ہیں۔'' اس کے برعکس تسلیم نیازی کے استاد علامہ ناوک حمزہ پوری تسلیم نیازی کے بارے میں کہتے ہیں، ''میں نے پہلے ہی عرض کیا ہے کہ شاعر تو وہ اِس ناچیز سے بہتر ہیں۔ وہ جس طرح متداولہ لفظیات و تراکیب کو اظہار کا ایک نیا روپ، ایک اچھوتا انداز عطا کر کے نئی معنویت عطا کر دیتے ہیں وہ بس انہیں کا حصہ ہے۔'' ایک جگہہ اور علامہ ناوک حمزہ پوری تسلیم نیازی کے بارے میں فرماتے ہیں، ''یہ بھی ان کی طرحدار نیازمندی کا اعجاز ہے کہ وہ مجھے اپنا استاد کہتے ہیں۔...... سچی بات یہی ہے کہ جناب تسلیم کی شاعرانہ عظمت خداداد ہے۔ فطرت نے خود اس لالہ کی حنابندی کی ہے۔ کبھی کبھی شاذ و نادر ایک آدھ لفظ یا اصطلاح یا فنی نکتے کے بارے میں پوچھ لینا استادی شاگردی کی تعریف میں نہیں آتا۔''

معراج احمد معراج کی شاعری کے ایک سرسری مطالعے سے جو چند خامیاں نظر آئی ہیں، انہیں قارئیں بھی ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ معراج کے یہاں ایطائے جلی کا گھناؤنا نمونہ ملاحظہ ہو۔

مر کر بھی فن کار ابھی تک زندہ ہے
اُس کا ہر شہکار ابھی تک زندہ ہے

معراج کے یہاں اجتماعِ ردیفین کی بیاری دیکھیں۔

اپنی غرض کے واسطے مت پھوٹ ڈالیئے
ہم کو جنابِ شیخ و برہمن نہ بانٹیئے

زبان کی جاہلانہ غلطی دیکھیں۔

اہلِ زر ہی شہر میں
اہلِ عز و جاہ ہے

یہاں 'ہے' کی جگہ 'ہیں' ہونا چاہیئے۔معراج کا یہ مصرعہ ملاحظہ ہو۔

اک گھر ہے مگر کتنی دواروں سے گھرا ہے

آپ نے 'دیواروں' کو کہیں اس حال میں دیکھا ہے؟ معراج کی کم زبانی کی ایک اور مثال ملاحظہ کریں۔

جواں سپاہ کو آواز دی تھی سرحد نے
شبِ وصال ہی ہونا پڑا دلہن سے الگ

سپاہ پوری فوج کو کہتے ہیں۔ایک فرد کے لئے سپاہی مستعمل ہے۔یہ مصرعہ دیکھیں۔

تارہ و سیارہ کو پہچان لینا چاہیئے

لفظِ تارا ہندی الاصل ہے۔جبکہ 'سیارہ' عربی الاصل ہے۔ایسے دو الفاظ کے درمیان واوِ اضافی کی ترکیب غلط ہے۔معراج کے یہاں شکستِ ناروا کی ایک بھونڈی مثال ملاحظہ ہو۔

مجھے علم ہے کہ ترے چمن، میں ہزاروں دل نشیں پھول ہیں

عربی و فارسی الفاظ کے سقوطِ حروفِ علت کا ایک نمونہ دیکھیں۔

ہمیں حسینی شجاعت عطا کرے مولیٰ

معراج کے شعروں میں تعقید کی ایک جھلک ملاحظہ ہو۔

بلند کرلیں خود آنگن کی میں نے دیواریں

اس قدر غلطیوں اور خامیوں کی کیچڑ میں گردن تک ڈوبا ہوا معراج احمد معراج جیسا ایک شاعر تسلیم نیازی جیسے شاعر پر انگشت نمائی کرتا ہے تو اسے کیا کہا جائے۔تسلیم نیازی کے بارے

میں نئی نسل کے نمائندہ شاعر، نقاد اور استاد پروفیسر ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی صاحب کی گراں قدر رائے ملاحظہ ہو، "تسلیم نیازی کی جوصلاحیت واہمیت ہے اس سے کسی کو انکار نہیں۔دیر سے ہی سہی ان کی انفرادیت اور عظمت کو اب سب مان رہے ہیں۔تسلیم صاحب آبروئے بنگالہ ہیں۔ان کے ہمعصروں میں ان کا مدمقابل فی الحال یہاں کوئی نہیں۔پڑھے لکھے لوگ ان کی قدر ضرور کرتے ہیں۔جو اچھل کود کرنے والے شعرا ہیں ان کی بات رہنے دیجئے۔جب دھند چھٹے گی، کھرے کھوٹے کی پہچان ہوجائے گی اور بیساکھی والوں کی شناخت بھی ہوجائے گی۔"

بلاشبہ معراج محنتی ہیں لیکن شعر کہنے کیلئے خونِ جگر کس طرح جلایا جاتا ہے اس سے وہ ناآشنا ہیں۔جب کہ نیازی کا حال تو یہ ہے کہ..

یوں ہی نہیں، تسلیم نیازی کی تو اک عمر
مٹی میں ملی ہے تو ہنر دِکھنے لگا ہے

یوں اپنی عمر کو مٹی میں ملانے کا حوصلہ اور جنون کتنوں کے پاس ہے؟! معراج احمد معراج ایک سرکاری ملازم اور فارغ البال شخص ہیں۔اس فارغ البالی کیلئے ملازمت کے علاوہ وہ مالی منفعت حاصل کرنے کے دوسرے ذرائع بھی استعمال کرتے ہیں اس کے بعد کچھ وقت بچ رہتا ہے تو اسے شاعری میں صرف کرتے ہیں اس طرح وہ جزوی طور پر ہی اس جنون سے جڑے ہوئے ہیں اور اس میں بھی خرد کو کلی طور پر خیرباد بھی نہیں کہتے بلکہ نام ونمود حاصل کرنے کے تمام مواقع پر ان کی پینی نگاہ رہتی ہے۔تسلیم کے دیوان پر ان کا مضمون بھی سستی شہرت حاصل کرنے کا ایک بہانہ بھر ہے ورنہ اس مضمون میں تضادِ بیانی کے ایسے نمونے نہیں ملتے کہ پڑھنے والا Confused ہوکر رہ جائے۔مضمون کی شروعات میں وہ شمس الرحمٰن فاروقی کے قول کہ "ہر بڑی شاعری میں یہ وسعت ہوتی ہے کہ ہزار مطالعے اور تجزیے کے بعد بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ کچھ بات ابھی ایسی باقی ہے جس کے وجود کا احساس تو ہمیں ہے لیکن وہ چیز گرفت میں نہیں آرہی ہے۔" کو نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تسلیم نیازی کے دیوان کے مطالعے اور تجزیے سے یہی حقیقت واشگاف ہوتی ہے۔لیکن فوراً ہی اپنی بات کو رد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

اندازِبیاں میں نقوش ،الفاظ،آہنگ اور لب ولہجہ جیسے عناصر ہی شعر کا حسن ہوتے ہیں ۔ان حقائق کے پیشِ نظر دیوان میں چند ہی اشعار ایسے ہیں جن میں متذکرہ صفات پائی جاتی ہیں ۔واضح رہے کہ مضمون کی ابتدا میں ہی وہ کہہ چکے ہیں کہ تسلیم نیازی کے دیوان ''مہوشعر'' کا معیار خاصا بلند ہے ۔اس میں بڑے عمدہ اور معنی خیز اشعار ہیں ۔لیکن آگے اپنی ہی بات کی نفی کرتے ہوئے وہ دیوان کے اشعار میں لفظی شعبدہ بازی ،ناموزونیت،تعقیدِلفظی اور اصولِ اضافت سے ناواقفیت جیسے معائبِ سخن کی موجودگی کا بہتان تراشنے لگتے ہیں ۔بہتان اس لئے کہ معائبِ سخن کے ضمن میں وہ جن اشعار کو پیش کرتے ہیں ان میں تلاشِ بسیار کے باوجود ان کے بیان کردہ عیب نہیں ملتے ۔البتہ دوچار اشعار میں کمپوزنگ کی غلطی کو وہ دانستہ شاعر کے سر ڈالنے پر مصر ہیں ۔ذرا ان کے پیش کردہ عیب دار اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

لفظی شعبدہ بازی:۔

ہونٹوں کی منڈیروں پہ ہی رہنے دو ہنسی کو
بیٹھی ہے جو دم بھر کو بچاری تھکی ماندی

ساقط الوزنی:۔

نے اپنی بھوک سے نہ شکاری کے داؤ سے
مجبور ہیں ہم ایسے پرندے سبھاؤ سے

تعقیدِلفظی:۔

اس فرطِ مسرت میں کہ جاں مانگی کسی نے
دیوانے ہوئے ایسے کہ ہم تو لگے جینے

لفظوں کی غلط دروبست:۔

اللہ رے 'خود فریب خودآسودگی' کا خبط
پھولوں کو سوچ سوچ کے پتھر ٹٹولنا

اصولِ اضافت وترکیب سے ناواقفیت:۔

سارے منظر ہیں دھند زائیدے
تو ہے منزل تو اب دکھائی دے

اصولِ تشبیہ واستعارہ سے ناواقفیت:۔

بوسہ دوگے تو سلیقے سے دو
زہر کھاتے نہیں ہم اتنا سا

طوالت کے خوف سے تمام اشعار درج نہیں کئے گئے ہیں ۔لیکن جو درج ہیں بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو معراج کی عصبیت اور نا اہلیت آشکار ہو جائیں گی ۔جس شعر پر لفظی شعبدہ بازی کا الزام عائد کیا گیا ہے کیا اس پر یہ صادق آتا ہے؟ تشبیہ،تمثیل،استعارے،علامتیں اور تراکیب وغیرہ تو محاسنِ سخن میں شامل ہیں ۔'ہونٹوں کی منڈیر' ' بیٹھی ہوئی ہنسی'اور'پھر تھکی ماندی'۔کیا خوبصورت اور نوزائیدہ ترکیب وتمثیل ہیں ۔کوئی بد ذوق ہی ہوگا جو ان کی داد نہ دے ۔ساقط الوزنی کے ثبوت کے طور پر جو شعر درج ہے اس میں انہیں 'سبھاؤ' کے وزن پر اعتراض ہے ۔جس سے ان کی کم علمی اور ہندی سے ناواقفیت عیاں ہوتی ہے ۔'سبھاؤ'بروزن فعول ہی ہوگا ۔تعقیدِ لفظی کے تحت جو شعر انہوں نے درج کیا ہے اسے پڑھ کر کسی بھی صاحبِ ذوق اور شعر فہم شخص کو ہنسی ہی آئے گی ۔درج بالا شعر'جاں مانگی کسی نے.....ہم تو لگے جینے'میں معراج 'کسی نے جاں مانگی.....ہم تو جینے لگے' دیکھنا چاہتے ہیں ۔لگتا ہے کہ مضمون لکھنے کے خبط میں وہ شعر اور نثر کے فرق کو ہی فراموش کر بیٹھے ہیں ۔اس طرح کی تعقیدِ لفظی کو شعر کا حسن کہا جاتا ہے ۔اگر ان کے جواز کو قبول کرتے ہوئے مشہور مقولے 'کھودا پہاڑ نکلا چوہا' کو'پہاڑ کھودا چوہا نکلا' کہا جائے تو نثری لحاظ سے تو مقولہ درست ہو جائے گا لیکن اس کے شعری آہنگ اور روانی پر جھاڑو پھر جائے گا ۔ایک اور مثال میں لفظ اللہ کو وہ مفعول کے وزن پر ہی برتنے کی تاکید کرتے ہیں ۔انہیں شاید علم نہیں کہ لفظ اللہ مفعول اور فعلن دونوں وزن پر جائز ہے ۔داغ کا یہ مصرعہ ملاحظہ ہو ۔ ع

اللہ کرے کہ بند نہ ہو داغ کی زباں

'خودفریب خودآسودگی' ایک مرکب لفظ ہے جسے وہ دو الگ ٹکڑوں میں سمجھ بیٹھے ہیں۔'دھند زائیدے' کی ترکیب کوغلط قرار دیا ہے کیونکہ ہندی لفظ کے ساتھ فارسی یا عربی لفظ کی ترکیب نہیں ہوسکتی۔ایسی حالت میں سینکڑوں الفاظ اردو سے خارج کرنے ہوں گے اوراساتذہ تک کورد کرنا ہوگا۔آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو الفاظ کے ذخیرے میں اضافہ کیا جائے نہ کہ لکیر کا فقیر بن کراس میں بے جا کٹوتی کی جائے۔معراج کوتو تسلیم نیازی کے دیوان کے نام پر بھی اعتراض ہے۔حیرت ہے کہ انہیں دوہا لہجہ کی ترکیب تو درست لگتی ہے لیکن "لہوشعر" کی ترکیب انہیں برداشت نہیں۔

اخیر میں مجھے یہ کہنے پر مجبور ہونا پڑ رہا ہے کہ مغربی بنگال میں پچھلے دس پندرہ برسوں کے درمیان شائع ہونے والے شعری مجموعوں کوفنی کسوٹی پر مکمل غیر جانبداری سے پرکھا جائے تو شاید ہی کوئی مجموعہ نکلے جو دیوانِ تسلیم کے قریب ٹھہر سکتا ہو۔تسلیم نیازی کی خامی یہ ہے کہ وہ کسی اونچے عہدے پر فائز نہیں اور نہ ہی منفعت بخش اور ثمر آور منصب پر ان کا کوئی گوڈفادر موجود ہے جو ان کی طرفداری کرے۔ورنہ "لہوشعر" کی شاعری ایسی نہیں کہ اسے نظرانداز کیا جاسکے۔بلکہ اس دیوان پر تو پورے بنگال کے اردو حلقے کو فخر ہونا چاہئے۔

تسلیم نیازی......اردو شاعری کی آبرو

پروفیسر ڈاکٹر عشرت بیتاب

تسلیم نیازی بنگال، جھارکھنڈ اور بہار میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔انہوں نے زندگی کو اپنی شاعری میں پوری طرح برتا ہے اور ذاتی نشاط والم کو کائناتی نشاط والم بنا کر پیش کرنے کی سعی کی ہے۔تسلیم نیازی بنیادی طور پر شاعر ہیں ان کی سوچ اور فکر میں وسعت وگہرائی ہے۔

ٹوٹتی پھوٹتی قدروں، نت نئے بدلتے زاویہ نگاہ، پرانی تہذیبوں کا زوال اور نئی تہذیبوں کے عروج سے موصوف نے جو کچھ اخذ کیا اسے نہایت ہی صحت مندانہ انداز سے قاری کے روبرو پیش کیا ہے۔ان کی شاعری پر عاصم شہواز شبلی کچھ یوں رقم طراز ہیں:۔

"تسلیم نیازی ایک پختہ کار اور ہفت رنگ شاعر ہیں۔ان کی تخلیقی توانائی تیزی کے ساتھ ان آفاق کی طرف گامزن ہے جہاں کچھ نئے ابعاد وجہات روشن بھی ہورہے ہیں اور اضافہ بھی ہورہا ہے۔بالخصوص غزل کے قیمتی سرمایے کو ثروت مند بنانے کی تگ ودو میں کوشاں ہیں۔"

وہی غزل جسے اردو شاعری کی سب سے مقبول صنف کہا جاتا ہے۔وہی غزل جس کا سہرا امیر خسرو کے سر بندھتا ہے۔جسے میر اور غالب نے معراج بخشا۔اسی غزل کی پاسداری کرتے ہوئے نئی نسل کے جواں فکر شاعر تسلیم نیازی عقیدت کے منتہائے عروج پر کمند گاڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ان کی غزلوں کا تیور دیکھیے

پھول، تتلی، پیڑ، آنگن سوچنا
اف جوانی میں لڑکپن سوچنا

تاحدِ نظر غبار بابا
کس کا ہے اشتہار بابا

چھوتی ہے دھول آسماں کو

یہ کون ہے شہسوار بابا

تسلیم نیازی کی شاعری سے متاثر ہو کر پروفیسر علیم اللہ حالی لکھتے ہیں:۔

''ان کی تخلیقی میلان کو میرؔ سے قریبی نسبت ہے میر ہی کی طرح تسلیم نیازی کے سادہ سے سادہ شعر میں احساس وفکر کا نا قابل پیمائش عمق ہے۔''

اور پھر آگے موصوف یہ شعر قلم بند کرتے ہیں۔

پلکوں پہ جگنوؤں کا تقرر نہیں تو کیا

آنکھوں میں تیرگی سے تعصب ضرور ہو

تسلیم نیازی کی غزلوں میں جمالیاتی رویہ بہت ٹھوس اور واضح ہے۔ان میں بنیادی طور پر رومانی جذبات کے ارتعاش کی کارفرمائی ہے۔لہجے میں محبت، شگفتگی اور تازگی ہے۔اظہار کی یہی سادگی دل میں اتر جاتی ہے۔جیسا کہ ڈاکٹر عنوان چشتی لکھتے ہیں:۔

''۔۔۔۔فطری شاعر ہونے کے سبب اور باصلاحیت شاعر ہونے کی وجہ سے ان کے تخلیقی عمل میں بڑی بے ساختگی ہے۔جو مستقبل میں انہیں قادرالکلام شاعروں کی صف میں کھڑا کردے گی۔''

سچ تو یہ ہے کہ تسلیم نیازی فن شاعری کے رموز سے پوری طرح واقف ہیں۔موصوف کے یہاں روایت کی گل کاری اور جذبے کی رنگارنگی کے امتزاج سے غزلوں میں ایک طرح کی کشش اور امتیازی شان در آتی ہے۔

تسلیم نیازی کی غزلوں کی لفظیات، ان کا لہجہ، ان کا اسلوب، ان کے علائم اور ان کے حسی وبصری پیکر الگ سے پہچانے جا سکتے ہیں۔ان کے اشعار میں زندگی کی رمق کے ساتھ ساتھ درد وغم کا بھی اظہار ملتا ہے ملاحظہ کیجئے:۔

مٹی فقیر کی میرا گارا فقیر کا

میں کیا،مرا تو سارے کا سارا فقیر کا

اس ایک شخص سے ملنا ملانا ختم ہوا

اب آسماں پہ میرا آنا جانا ختم ہوا

کچھ تو ہے گردشِ ایام سے رشتہ اُس کا

ورنہ یہ کیوں میرے اصرار پہ رک جاتی ہے

سچائی کے اظہار میں ان کی بے باکی اور صاف گوئی قابل داد وتحسین ہے۔اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فکر وشعور کے اعتبار سے وہ اپنے ہم عصروں میں ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔سچ تو یہ ہے کہ تسلیم نیازی بنیادی طور پر شاعر ہیں جہاں سے جو بھی اکتساب کرتے ہیں اسے شعر کے پیکر میں ڈھال دیتے ہیں۔ان کی غزلوں کا اپنا ایک خاص رنگ وآہنگ اور لب ولہجہ ہے جو ہر شاعر کے نصیب کی بات نہیں۔

تسلیم نیازی کی غزلوں میں صرف انفرادی زندگی کی آسودگی اور ناآسودگی ہی نہیں بلکہ اجتماعی زندگی کے معاملات اور مسائل بھی ہیں:۔

تسلیم نیازی نے غزل کے روایتی حصار سے باہر نکل کر الفاظ وبیاں کی تازگی وشگفتگی فکر وخیال کے نئے آفاق، جذبہ واحساس کی دبیز تہہ داری اور شعوری بصیرت کا ہنر مندانہ اظہار کیا ہے۔محبوب انور سچ ہی لکھتے ہیں: ''ان کی غزلیں عہد نو کی شادمانیوں، تلخ کامیوں، شیریں لمحوں کے ساتھ ہی خوف اور اندیشوں کی ایک حیرت ناک جلوہ گاہ کی طرح ہیں ان کی شاعری میں اظہار ذات اور ادارک وکائنات دونوں کی آمیزش ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب شاعر کو اپنی ذات کا عرفان وادراک ہو۔''

آخر میں تسلیم نیازی کے اس شعر کے ساتھ جدا ہوتا ہوں

بے لباسیِ تخیل میں غنیمت ہے غزل

ایک اک حرف بُنا ہے تو لبادہ ہوا ہے

تسلیم نیازی......واقعات کے آئینے میں

وقیع منظر

یہ اپریل ۱۹۸۴ء کا واقعہ ہے۔جہانگیری محلّہ آسنسول میں ایک طرحی مشاعرہ برپا تھا۔شعراء باری باری سے مائک پر آرہے تھے اور اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کر رہے تھے۔شعراء کی فہرست میں ۱۸؍سال کے ایک نوجوان شاعر کا نام بھی درج تھا۔جو انتہائی بے چینی مگر قدرے گھبراہٹ کے ساتھ اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا۔جب صدر مشاعرہ نے بھی اپنا کلام پڑھ لیا تو نوجوان کی بے چینی مایوسی میں تبدیل ہوگئی۔دوسرا دور یعنی غیر طرحی دور شروع ہی ہونے والا تھا کہ منتظمین مشاعرہ میں سے ایک بندۂ خدا نے نقیب کو اس سے ہوئی غلطی کا احساس دلایا۔اور اس طرح سے اس نوجوان شاعر نے Debut مشاعرے میں صدر کے بھی بعد پڑھنے کا شرف حاصل کیا۔اس طرحی مشاعرے میں پڑھی گئی غزل کے دو شعر سے آپ بھی محظوظ ہوں۔

خالی نہ ایک لحہ بھی دل کا مکاں رہے
گر وہ نہیں رہے تو غمِ دو جہاں رہے
دیکھے نہ مرے فن کو مری عمر سے مثال
اک چھوٹی سی صدف میں بھی موتی نہاں رہے

اسی سال ایک مجلّہ میں پہلی بار اس کی ایک غزل بھی شائع ہوئی۔جس کا ایک مطلع اور ایک شعر ملاحظہ ہوں۔

کھڑا کھڑا بھی نہ تھا وہ، جھکا جھکا بھی نہ تھا
وہ آدمی نہ تھا تسلیم تو خدا بھی نہ تھا
ہر ایک پل مرے وہم وگماں میں رہتا تھا
وہ ایک شخص جو مجھ سے کبھی ملا بھی نہ تھا

اسی نوع کا ایک اور واقعہ مجھے یاد آرہا ہے جو ۱۹۹۳ء میں رونما ہوا تھا۔شہر آہن برنپور کے ایک مضافاتی قصبے میں ادارہ ہم لوگ کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان کل ہند مشاعرہ منعقد ہوا تھا۔جس کی صدارت جناب سالک لکھنوی کر رہے تھے۔مشاعرے کے آغاز سے پہلے آسنسول ومضافات کے صاحب کتاب شعراء وادباء کے درمیان توصیفی اسناد تقسیم کی جانی تھیں۔جس کے لئے تسلیم نیازی کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔واضح ہو کہ ۱۹۹۲ء میں ہی تسلیم نیازی کا شعری مجموعہ ''ڈالفن'' منظر عام پر آچکا تھا۔میں وقیع منظر اور مشہور ومعروف افسانہ نگار وشاعر جناب سلیم سرفراز اگرچہ بحیثیت شاعر مدعو نہیں تھے تاہم صرف اس نوجوان شاعر کی محبت میں ہم سامعین کے درمیان بیٹھے ہوئے تھے۔گردونواح کے تمام صاحب کتاب شعراء وادباء نے جناب سالک لکھنوی کے دست مبارک سے اپنے اپنے حصے کی سند حاصل کرلی۔لیکن تسلیم نیازی کے ساتھ پھر وہی ہوا۔

تقریب کا پہلا دور ختم ہو چکا تھا۔مشاعرے کی کارروائی بھی باقاعدہ شروع ہو چکی تھی اس دوران ہم نے منتظمین سے بیسیوں بار پوچھ لیا کہ ڈالفن کے خالق تسلیم نیازی کو توصیفی سند کیوں نہیں دی گئی۔لیکن جب ہمیں ان کی طرف سے کوئی خاطر خواہ جواب نہیں ملا تو تنگ آکر برادرم سلیم سرفراز اور میں نے محترم سالک لکھنوی (جن کی گود میں شعری مجموعہ ڈالفن موجود تھا) کے نام ایک رقعہ لکھ کر ان کی توجہ منتظمین کی اس احمقانہ حرکت کی طرف مبذول کروانے کی کوشش کی۔ہماری یہ کوشش فوراً ہی رنگ لائی۔محترم سالک لکھنوی نے خط کا باضابطہ جواب بھی دیا جس میں انہوں نے لکھا......''تسلیم نیازی کا شعری مجموعہ ڈالفن جسے انہوں نے مجھے مشاعرہ سے قبل عنایت کیا ہے،میرے ہاتھ میں ہے اور جس کو میں جستہ جستہ پڑھ بھی رہا ہوں۔اچھی کتاب ہے۔منتظمین سے میں نے اس بابت بات کی ہے۔جلد ہی آپ کی شکایت کا ازالہ ہوگا۔''

مشاعرہ اپنے پورے شباب پر پہنچ چکا تھا کہ اچانک نقیب کی آواز گونجی ''سٹیج کی کارروائی اب تک جمہوری انداز میں چل رہی تھی۔لیکن اب یہاں صدر راج نافذ ہوگیا ہے۔بحکم صدر میں معذرت کے ساتھ ڈالفن کے خالق تسلیم نیازی کو آواز دے رہا ہوں کہ وہ آئیں اور اپنی توصیفی سند صدر کے ہاتھوں قبول فرمائیں۔''

تسلیم نیازی کی شعری وادبی زندگی کے سب سے اذیت ناک واقعے کا ذکر تو ابھی ہوا ہی نہیں۔ادارہ ہم لوگ کی جانب سے برہنپور میں ایک بنگال و بہار مشاعرے کا انعقاد کیا گیا تھا۔مشاعرے کے اختتام کے بعد شب کی غذا کا نظم بزرگ شاعر اور مشاعرے کے انتظام کار حضرت محبوب انور کے دولت خانے پر ہوا تھا۔کھانے سے قبل گپ شپ کا دور چل رہا تھا۔تسلیم نیازی صوفے پر بیٹھے تھے اور ان کی ڈائری ان کے پہلو میں ہی رکھی ہوئی تھی۔ایک خوش گلو شاعر نے اسی دوران ان کی ڈائری اٹھالی اور اس کے مندرجات ومشمولات سے لطف اندوز ہونے لگا۔تبھی کھانے کیلئے دوسرے کمرے سے برہنپور کے شعراء کا بلاوا آیا۔تسلیم نیازی نے ہمدم اعظمی مرحوم،ایمن بھاگلپوری مرحوم،قیصر پرتاپ گڑھی مرحوم اور مضراب خان کے ساتھ کھانا کھایا اور انہی صاحبان کے ساتھ اپنے گھر کی راہ لی۔تسلیم نیازی کے گھر سے محبوب انور صاحب کے گھر فاصلہ ایک کلومیٹر سے کم ہی ہوگا اور اس مختصر مسافت کا نصف حصہ بھی ابھی طے نہ ہوا تھا کہ تسلیم نیازی کو احساس ہوا کہ ان کی ڈائری تو محبوب صاحب کے گھر ہی میں چھوٹ گئی۔ایمن بھاگلپوری مرحوم نے کہا" چلئے واپس چل کر ڈائری لے لیتے ہیں۔"ہمدم اعظمی مرحوم نے کہا "آپ لوگ یہیں ٹھہریں۔میں ڈائری لیکر آتا ہوں۔"غرض یہ کہ اس قافلے میں شامل تمام لوگوں نے اصرار کیا کہ ڈائری ابھی کی ابھی محبوب صاحب کے گھر سے لے لی جائے۔لیکن تسلیم نیازی ٹس سے مس نہ ہوئے۔انہوں نے کہا"ڈائری کو رات بھر میں کیا ہوجائے گا؟ آسنسول میں کل ہی ایک کل ہند مشاعرہ ہونے والا ہے۔وہاں میرے ساتھ محبوب انور صاحب بھی مدعو ہیں۔کل ان کے گھر سے ڈائری بھی لے لی جائے گی اور انہیں مشاعرے کیلئے ہم رکاب بھی کرلیا جائے گا۔"

دوسری رات مشاعرے کے لئے خود کو بالکل تیار کرکے تسلیم نیازی محبوب انور کے دروازے پر پہنچے اور دستک دی۔نیم وا دروازے کے عقب سے محبوب صاحب نمودار ہوئے۔شکل سے بیمار نظر آرہے تھے۔تسلیم نیازی کو گھر کے اندر بھی نہ بلایا۔کہنے لگے"میں تو مشاعرے میں شریک ہونے سے قاصر ہوں۔میری طبیعت اچانک بگڑ گئی ہے۔"ڈائری کے بارے میں استفسار کرنے پر کہا"یہاں تو ایسی کوئی ڈائری موجود نہیں۔کل جب تم میرے گھر

کھانے پر آئے تھے تو ڈائری تمہارے ہاتھ میں تھی ہی نہیں۔تم نے یقیناً اسے اسٹیج پر ہی چھوڑ دیا ہے۔"

اس حادثے کے بعد تسلیم نیازی کی ذہنی کیفیت افسوسناک تھی۔پڑھنا لکھنا انہوں نے بالکل ترک کردیا۔خطوط کے جواب دینے سے بھی گریز کرنے لگے۔شعری مجالس میں آنا جانا بھی موقوف کردیا۔گوشہ نشیں ہوکر رہ گئے بے چارے تسلیم نیازی۔ان کی یہ گریز پائی تقریباً دس سال تک جاری رہی۔اسی زمانے میں ایک بار میں نے ان سے پوچھا تھا،"تسلیم بھائی،کیا صرف ساٹھ ستر غزلوں کا زیاں ہی آپ کی شعری سلطنت کے خاتمے کا سبب بن گیا۔!؟" کہا،"نہیں! بلکہ اس لئے کہ ڈائری کے ساتھ میرا یقین بھی گم ہوگیا۔"

سب سے حیرت ناک واقعہ تو یہ ہوا کہ تقریباً چودہ سال کے بعد تسلیم نیازی کی گمشدہ ڈائری وہیں سے ملی جہاں سے غائب ہوئی تھی۔ابھی سال بھر قبل محبوب انور صاحب نے تسلیم نیازی کو اپنے گھر بلا کر ڈائری ان کے سپرد کردی۔لیکن تب تک وہ گمشدہ ڈائری تسلیم نیازی کیلئے بیکار ہوچکی تھی۔کیوں کہ ان کا کھویا ہوا یقین انہیں اس سے کہیں پہلے مل چکا تھا۔تسلیم نیازی کی اس نشاۃِ ثانیہ کا سہرا یہاں کے ادب نوازوں کے سر جاتا ہے۔جنہوں نے ہر مرحلے پر شاعرِ مظلوم تسلیم نیازی کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔میری اس تحریر سے اگر کسی بے قصور کا دل دُکھے تو خدا مجھے کبھی معاف نہ کرے۔

تسلیم نیازی ....ایک باوقار شاعر

مسرت حسین عازم

خلافِ معمول آج عبدالرحمان صاحب کی آنکھ قدرے دیر سے کھلی ۔وہ کمرے سے نکل کر سیدھے آنگن میں اتر آئے اور آسمان کی طرف دیکھا۔نمازِ فجر کا وقت ابھی گزرا نہیں تھا۔لیکن کم ضرور تھا۔وہ تیز قدموں سے مسجد کی جانب چل پڑے۔گاؤں کی اس چھوٹی سی مسجد میں کوئی مئوذن یا امام مقرر نہیں تھا۔کوئی اللہ کا بندہ کبھی امامت کی ذمہ داری نبھالیا کرتا تھا۔کبھی کوئی اذان دے دیا کرتا تھا۔رحمان صاحب نے وضو کے پانی کے لئے مسجد کے احاطے میں واقع کنوئیں میں ڈول ڈالی۔عجلت میں ڈول کے ساتھ وہ خود کنوئیں میں گر پڑے۔اس حادثے میں ان کی جان تو بچ گئی مگر ان کی یادداشت چلی گئی۔وہ ہمیشہ کے لئے خود فراموش ہو گئے۔رحمان صاحب کی یہی خود فراموشی دھیرے دھیرے مجذوبیت میں تبدیل ہونے لگی۔کسی کو دم کر دیا تو وہ ٹھیک ہو گیا۔کسی نے عدالت میں حاضر ہونے سے پہلے ان کی زیارت کر لی تو فیصلہ اسی کے حق میں ہو گیا۔غرضیکہ رفتہ رفتہ ان کے کشف و کرامات کی خبریں گاؤں سے نکل کر قرب و جوار تک پہنچ گئیں۔گھر میں عقیدتمندوں کا میلہ لگنے لگا۔اہلیہ بالکل الگ مزاج کی تھیں۔انہیں بھیڑ بھاڑ سے کوفت ہوتی تھی۔با دلِ ناخواستہ لوگوں کو برداشت کرتی تھیں۔ویسے بھی یکے بعد دیگرے مسلسل تین نوزائیدگان کی ناگہانی اموات کے صدمے نے انہیں چڑچڑا بنا دیا تھا۔ان کی پہلی اولاد کی شکل میں ایک بیٹی تھی ۔جس کے سنِ بلوغت کو پہنچنے کے بعد ان کے یہاں چوتھی اولادِ نرینہ کی پیدائش ہوئی جو باحیات رہ سکی۔پہلی اولاد ان کی بیٹی اور آخری اولاد ان کے بیٹے کے درمیان سولہ سال کا فاصلہ تھا۔

بیٹا جب سات سال کا ہوا اور والدین کے لاڈ پیار کو کما حقہ سمجھنے لگا تو والد اللہ کو پیارے ہو گئے ۔ کلکتے میں ملازمت پذیر خالہ زاد اور چچا زاد بھائی نے خاندان کی کفالت کی ذمہ داری سنبھال لی۔اس دوران بیٹی کی شادی بھی ہو گئی۔گھر میں ماں بیٹے اکیلے رہ گئے۔سال بھر بھی نہ گزرا کہ

بیٹی نے ماں اور بھائی کو اپنے سسرال آسنسول بلالیا۔تیرہ سال کے ہوں گے تسلیم نیازی جب وہ آسنسول آئے تھے۔اسی عمر سے ان کی شاعری کی شروعات بھی ہوئی تھی۔اٹھارہ سال کی عمر میں پہلی بار مشاعرے میں اپنا کلام پڑھا۔اسی عمر میں ان کی شعری کاوش رسالے کی زینت بھی بنی۔

تسلیم نیازی ایک قادرالکلام اور ہمہ جہت فنکار ہیں۔انہوں نے تقریباً تمام مروجہ بحور میں نہ صرف طبع آزمائی کی ہے بلکہ مروجہ بحور کی تعداد میں اضافہ بھی کیا ہے۔1993 میں تسلیم نیازی نے دو بحریں ایجاد کیں۔جن میں ایک بحرِ وافر مثنیٰ سالم (مفاعلتن) اور دوسری بحرِ کامل مثنیٰ سالم (متفاعلن) ہیں۔کوہر شیخپوری کی کتاب "گوہرِ عروض و بلاغت" اور پروفیسر انور مینائی کی کتاب "شہکارِ عروض و بلاغت" میں ان کا حوالہ موجود ہے۔بلاشبہ تسلیم نیازی کا شمار بھی ماہرِ عروض و بلاغت میں ہوتا ہے۔

تسلیم نیازی نے تقریباً تمام مروجہ اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔جن میں غزلوں اور نظموں کے علاوہ رباعیات، قطعات، ثلاثی، سانیٹ، ترائیلے، رینگا، ٹنکا، ہائیکو، دوہا، ماہیہ، واسوخت، ریختی، غزل نما، آزاد غزل، کنڈلی، کہہ مکرنی اور گیت وغیرہ شامل ہیں۔یہاں تک کہ تقریباً سو اشعار پر مشتمل ایک قصیدہ بھی انہوں نے لکھا جو ان کے دیوان "لہو شعر" میں شامل ہے۔جن سے ان کی فنکارانہ و استادانہ دسترس کا پتا ملتا ہے۔

یہ فخر ومباہات کی بات نہ صرف تسلیم نیازی اور شہر آسنسول بلکہ مغربی بنگال کے لئے بھی ہے کہ انہوں نے 1992 میں اپنی محنت و ریاضت کا ثمرہ "ڈالفن" اردو قارئین کے دستِ ہنر کے حوالے کیا۔جس کی خاطر خواہ پذیرائی بھی ہوئی۔انہوں نے بہت جلد اپنے بزرگ و ہمعصر شعرا کی نظر میں مقامِ اعتبار حاصل کر لیا۔ڈالفن سے انہیں بے پناہ شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی لیکن بدقسمتی سے ڈالفن کا پہلا پڑاؤ پار کرتے ہی انہوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی اور دنیائے شعر و ادب سے یکسر کنارہ کش ہو گئے۔کسی بدخواہ، بدنیت اور حاسد نے ان کے اعتماد کو ایسی ٹھیس پہنچائی کہ تقریباً بارہ چودہ سال کے لئے ان پر جمود طاری ہو گیا۔ایک بزرگ شاعر نے قصداً ان کی بیاض گم کر دی تھی۔

تسلیم نیازی کو صرف صنفِ شاعری سے ہی شغف نہیں بلکہ وہ ایک افسانہ نگار و انشا پرداز بھی

ہیں۔ان کا افسانہ ''میں تھک چکی ہوں'' ایک زمانے میں کافی مقبول ہوا تھا۔''کتاب لہو کتاب'' اور ''چودہ بکروں کا عذاب'' جیسے انشائیوں نے بھی پذیرائی حاصل کی۔حالیہ دنوں میں ان کے افسانے ''رتی بنجارن'' نے بھی لوگوں کو چونکایا۔

تسلیم نیازی جیسے باوقار شاعر کو ہم یونہی ضائع نہیں کر سکتے تھے۔وہ ہمارے لئے ایک بیش قیمتی سرمایے سے کم نہ تھے۔لہٰذا انہیں متحرک کرنے کی ہم نے لگاتار کوششیں کیں۔بالآخر انہیں شعروادب کی دنیا میں واپس لانا ممکن ہو سکا۔

نشاۃِ ثانیہ کے بعد ان کی شاعری پھر سے حسین ترغنچہائے تازہ کھلانے لگی۔ایک بار پھر وہ شعری وادبی افق پر نمودار ہو کر اپنے قلم کی جولانیاں بکھیرنے لگے اور گیسوئے اردو سنوارنے کے لئے اپنا خون جگر پلانے پر مائل ہو گئے۔اسی دوران ان کی دوسری کتاب ''لہو شعر (دیوانِ تسلیم نیازی)'' منصۂ شہود پر جلوہ افروز ہوئی۔

تسلیم نیازی خداداد صلاحیت کے مالک ایک فطری شاعر ہیں۔جن کے اندر بے پناہ فنی، فکری و تخلیقی صلاحیتیں موجود ہیں۔لیکن افسوس کہ انتہائی باصلاحیت فنکار ہونے کے باوجود دنیائے شعروادب میں انہیں اب تک وہ مقام ومرتبہ حاصل نہ ہو سکا جس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں۔انہوں نے اردو ادب کی بڑی ذمہ داری سے خدمات انجام دی ہیں اور آج بھی دے رہے ہیں۔ایسا بھی نہیں کہ انہوں نے اپنے فکروفن سے دنیائے شعروادب کو واقف کرانے کی کوشش نہیں کی۔عرصۂ دراز سے رسائل وجرائد میں ان کی تخالیق شائع ہوتی رہی ہیں۔ہاں یہ بات الگ ہے کہ خود انہوں نے کبھی اپنے نابغہ روزگار ہونے کا اعلان نہیں کیا اور نہ ہی کبھی کسی سے اس کا مطالبہ کیا کہ ان کی حیثیت تسلیم کر لی جائے۔

ہمارے ممدوح تسلیم نیازی کا کمالِ ہنرمندی

پرویز ساحر (ایبٹ آباد، پاکستان)

جس بھی شاعر کو قدرت کی طرف سے تخلیقی جوہر ودیعت کیا گیا، وہ شاعری تو کرے گا ہی۔اصل میں دیکھنا یہ ہے کہ شاعروں کے اس ہجومِ بے سراں میں کون سا اصلی شاعر فکروفن میں ارتقائی منازل سر کرتے ہوئے مسلسل معیاری شاعری معرضِ تخلیق میں لا کر اپنے فن کا لوہا منواتا ہے۔شاعری میں علی الخصوص جب بات ہو غزل کی تو معاملہ بہ صد گونہ پیچیدہ اور دشوار تر ہو جاتا ہے۔بدایں حوالہ راقم الحروف نے کہیں یہ نکتہ کہہ رکھا ہے کہ فی زمانہ معیار سے مزین شعر معرضِ تخلیق میں لانا فی الواقع لہو کی کلیاں کرنے کے مترادف ہے۔ہمارے ممدوح تسلیم نیازی کا کمالِ ہنرمندی یہ ہے کہ انہوں نے رسمی شعر گویاں سے درکنار نئی سے نئی وضعیں تراشنے، تازہ بہ تازہ مضامین تلاشنے، عمق دار فنی بنت کاری اور لسانی ثروت مندی کے ساتھوں ساتھ مکمل اسلوبیاتی انفرادی کی بہ دولت معاصر ادبی منظرنامہ میں اپنا شاعرانہ وقار اور ادبی اعتبار بہ حدِ کافی قایم کر لیا ہے۔

حوصلہ پارے

تسلیم نیازی نوجوان ہیں۔ کسی ادیب یا شاعر کا نوجوان ہونا بذات خود کوئی وصف نہیں لیکن اگر کم عمری میں ہی چکنے چکنے پات نظر آ رہے ہوں تو پروا کے ہونہار ہونے کی اطلاع تو دی ہی جا سکتی ہے۔ یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہے کہ تسلیم نیازی کا ذہن تجربہ پسند ہے......وہ غزل تو کہتے ہیں کہ اردو کا ہر شاعر غزل کہتا ہے لیکن اس کے علاوہ وہ رباعی بھی کہتے ہیں جسے عموماً پختہ مشقی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ جو شاعر کھلے ذہن سے سوچتا ہو اور موجودہ دور کی شاعری کے بڑے دھارے سے منسلک ہو وہ ہماری پذیرائی کا مستحق ہے۔

مظہر امام (۳؍مئی ۱۹۹۲ء)

آپ کے تجربہ پسند ذہن نے لفظوں میں جس طرح اپنے آپ کو تلاش کرنے کی سعی کی ہے وہ تخلیقی سفر کے روشن امکانات کا اشارہ ہے۔ آپ نے جو راہ اپنائی ہے وہ مشکل تو ضرور ہے لیکن یہی زندہ ادب کی ضروری شرط بھی ہے۔ آپ کی شاعری اچھی ہے۔ اس میں فکری تساہل کی جگہ تجسس کی حرکت قاری کی شناخت کرتی ہے۔ مختلف اصناف میں آپ کی طبع آزمائی بھی تخلیقی زرخیزی کا احساس دلاتی ہے۔

ندا فاضلی (۲۲؍نومبر ۱۹۹۳ء)

آپ شاعر ہی نہیں اچھا تنقیدی شعور بھی رکھتے ہیں۔ آپ میں شاعرانہ صلاحیت فطری ہے اسے محنت کے ساتھ آگے بڑھائیے۔ آپ کی ادبی صلاحیت سے امید ہے کہ ایک نہ ایک روز ادب میں ایک اعلیٰ مقام ضرور حاصل کر لیں گے۔ آپ کی غزلوں میں شعری پیکر لطیف جمالیاتی حس لئے نظر آتے ہیں۔ آپ کی بعض علامتوں میں پرت پرت معنویت پائی جاتی ہے مثلاً

وہ شخص میری ریڑھ کی ہڈی سے ڈر گیا
ورنہ وہ مجھ کو کیوں مجھے کیوں لوٹا کے گھر گیا

اب آبرو ہے اجنبی موسم کے ہاتھ میں
سورج کنواری مٹی کی بو سونگھ کر گیا

مو اخر الذکر شعر میں Sex symbol بڑے نازک پیرائے میں ظاہر ہوا ہے۔

''کوئی حادثہ؟''
''نہیں، خودکشی!''

چار لفظوں میں آپ نے نہ جانے کیا کیا کہہ دیا۔ موجودہ حیات کی بے معنویت کا اس سے بہتر اظہار کیا ہو سکتا ہے۔ آپ کی نظموں اور غزلوں کے علاوہ دوہے، ماہئے، ہائیکو، سانٹ، رباعیاں بھی بہت خوب ہیں۔ آپ سے بڑی توقعات وابستہ ہیں.

ڈاکٹر کرامت علی کرامت (۱۹؍ستمبر ۱۹۹۲ء)

معاصر شعرا میں تسلیم نیازی کا نام جانا پہچانا ہے۔ ان کی اکثر رباعیاں نظر سے گزری ہیں۔ ان رباعیوں کے مطالعے سے محسوس ہوا ہے کہ تسلیم نیازی کی طبیعت رباعی سے میل کھاتی ہے۔ وہ اس کے مزاج آشنا ہیں اور اس کے رموز و آداب پر نگاہ رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر طلحہ رضوی برق (۱۵؍مئی ۱۹۹۶ء)

غزلیں تو بہت عمدہ کہتے ہیں آپ اور نظمیں بھی۔ لیکن بھلے آدمی، زبان و بیان اور اوزان و بحور پر اتنا عبور رکھنے کے باوجود لوگ باگ جن نثر پاروں کو نثری نظم کا نام دئے ہوئے ہیں اور بنامِ تجربہ اپنے عجز کی پردہ پوشی کر رہے ہیں ان کی ہمنوائی آپ جیسا قادر الکلام شاعر کیوں کرے!

عتیق احمد عتیق

تسلیم نیازی نے روایتی اور تقلیدی عناصر سے خود کو الگ رکھا ہے.......حیات کی سچائی کو پیش کرنے کے لئے تسلیم نیازی نے تجربہ و مشاہدہ سے سو ناتراشا ہے.......صحت مند روایات کے تناظر میں انسانی نفسیات کی ترجمانی جس اعلیٰ سطح پر ہوئی ہے اس میں ان کی انفرادیت پوشیدہ ہے۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی (۱۹۹۳ء)

نیازی کی شاعری کا موضوع پھیلا ہوا ہے۔زبان و بیان پر ان کی بھر پور گرفت ہے۔آنے والا دور انکی شاعری کا ایک تابناک دور ہوگا۔موصوف کو خصوصی طور پر یہ مشورہ دیتا ہوں کہ وہ غزل کی طرف خصوصی توجہ دیں۔

ڈاکٹر مظفر بلخی (۱۷رجنوری ۱۹۹۴ء)

تسلیم کی فکری بلوغت، احساس کی رفعت یہ ظاہر ہونے نہیں دیتی کہ وہ ابھی نوجوان ہیں۔ ان کی شاعری پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنی عمر سے بہت آگے ہیں۔

ڈاکٹر رفعت اختر (یکم نومبر ۱۹۹۲ء)

اس میں کوئی شک نہیں کہ تسلیم نیازی بلا کے ذہین ہیں۔خود ان کے تنقیص کار بھی انکی ذہانت کا لوہا مانتے ہیں۔ان میں بڑا شاعر بننے کی تمام تر صلاحتیں موجود ہیں۔

پروفیسر طٰحہٰ شیم (۲۰رتمبر ۱۹۹۳ء)

آئینہ صاف وہی کہلاتا ہے جو چہرے کے تمام خدو خال کو ہر جگہ سے اجاگر کردے۔تا کہ اُس کی اصلی ہیئت سامنے آجائے۔یہی بات تسلیم نیازی کے لئے کافی ہے کہ انہوں نے اپنے احساس و جذبات کی ترسیل کے لئے جن الفاظ کا سہارا لیا ہے وہ عوام الناس سے بہت زیادہ قریب ہے۔لہٰذا میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں تسلیم صاحب کا یہ شعری

مجموعہ (ڈالفن) عوام میں مقبولیت کا حامل ہوگا۔

مضطر عظیم آبادی (۱۹۹۲)

ماشاللہ آپ بہت اچھے شاعر ہیں اور اللہ نے آپ کو قوتِ گویائی کی دولت سے مالا مال کیا ہے۔آپ نے شعر گوئی کی خوب ریاضت اور مشقت کی ہے۔

عالم خورشید (پٹنہ، بہار)

آپ کی کوئی مثال نہیں۔دل پر اثر کرنے والا کلام ہے آپ کا۔کلام میں جو خیال پیش ہوتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے آپ کلام سے خود کو لکھ رہے ہوں۔اُس میں ہم اپنی کیفیت پالیتے ہیں۔واہ کیا شعر ہوتے ہیں آپ کے۔ایسی شاعری دیوانگی کے بغیر ممکن نہیں۔کبھی مشکل تو کبھی آسان لگتا ہے کلام آپ کا۔آپ کا شعر ہمیں اپنی وارداتِ قلبی محسوس ہوتا ہے۔ہم بڑے جنون کے ساتھ پڑھتے ہیں آپ کو۔

غزل جمادار (اورنگ آباد، مہاراشٹر)

مجموعے کا بے حد عمدہ اور معنی خیز نام ہے جنابِ عالی اور آپ کی شاعری بھی متاثر کرتی ہے۔ایک مشورہ ہے کہ زود گوئی سے بچیں۔آپ کے یہاں بڑی شاعری کے امکانات روشن اور واضح ہیں۔

سید شاکر نفیس (ایڈووکیٹ، علی گڑھ)

شاعری، سگریٹ نوشی اور آزاد خیالی جیسی بری لت اگر اُس کی زندگی میں قبل از وقت سرایت نہ کرتی تو تسلیم نیازی آج اُس مقام پر ہوتا جہاں کم از کم اس کی شاعری تو اُسے کبھی پہنچا نہیں سکتی۔مجھے تسلیم نیازی سے جس قدر توقع تھی ملی نہیں۔

عتیق الرحمان منو (ویاؤ، پٹنہ)

اتنی کم عمری میں ہی اتنی اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کرنا اور بہت حد تک فن کے تقاضوں کو بھی پورا کرنا ایک ایسی اساطیری حقیقت ہے جو صرف ڈالفن کے شاعر تسلیم نیازی سے ہی وابستہ ہوسکتی ہے۔ میں انہیں دنیائے شاعری کا سچن تندولکر کہتا ہوں۔

شکیل انور ایم اے، صحافی (۱۹۹۲)

تسلیم نیازی آسنسول کے پہلے شاعر ہیں جو اپنا شعری مجموعہ ڈالفن لے کر آئے ہیں۔ خدا کرے کہ اُن کا مجموعہ ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے!

ضیاالرحمان ضیا (۱۹۹۲)

آٹھ سال کے بعد جب اُس (تسلیم نیازی) کی شاعری کو دوبارہ سننے اور پڑھنے کا موقع ملا تو مجھے لگا کہ اب وہ نوعمر، شرمیلا سالڑکا صرف جسمانی طور پر ہی جوان نظر نہیں آتا۔ بلکہ وہ ذہنی طور پر بھی بالغ ہو چکا ہے۔ میرے خیال میں ڈالفن کی اشاعت آسنسول کی ادبی تاریخ میں ایک نئے باب کی شروعات ہوگی۔

غلام محمد انصاری (جہانگیری محلّہ، آسنسول، ۱۹۹۲)

خوب کہتے ہیں بھائی...... منفرد اسلوب ہے...... واہ واہ!

رسول ساقی

تسلیم نیازی ایک منفرد اور حقیقی شاعر ہیں۔ ان کو صاحبِ دیوان شاعر ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ایسے باصلاحیت شاعر کو سر آنکھوں پر بٹھانا چاہیئے۔

ندیم صادق (آسنسول)

تسلیم نیازی صاحب کی شاعری معیاری شاعری ہے۔ اس کا اعتراف ہمارے بڑوں نے

کیا ہے۔ اعزاز و اکرام فنکار کے فن کی کسوٹی نہیں ہوتے۔ ایوارڈ پانے والے اکثر لوگوں کے سروں پر سیاست دانوں کے دست کرم رہتے ہیں۔ نوبل انعام بھی اس زمرے میں آتے ہیں۔ تسلیم نیازی ایک استاد شاعر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جیسا کہ ان کے کلام سے پتا چلتا ہے۔ تسلیم نیازی کی شاعری سے ہمیں فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

جعفر دانش (کٹک، اڑیسہ)

جناب تسلیم نیازی صاحب، ظلم، ناانصافی، اور جانبداری کے خلاف صدائے احتجاج بلند نہ کرنا بھی جرم ہے۔ خاموشی کی حد مقرر کیجئے۔ آپ کو خالقِ کائنات نے بے پناہ خلاقانہ دولت سے نوازا ہے۔ آپ اس دولت کی حفاظت کریں۔

شہنواز حسین (برنپور، آسنسول)

آپ بہت عمدہ شاعر ہیں۔ ہمارے جیسے لوگ آپ سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ آپ یقیناً اساتذہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔

زاہد علی خان (لاہور، پاکستان)

مدتوں سے رکا ہُوا ہے سفر
روز و شب زاد و رخت کٹ رہے ہیں

آپ کے لہجے کی قسم...... سچ ہے۔ کیا کہنے ہیں...... آپ کی دقتِ نظر کا حصہ ہے۔ اگر قاری خلوص سے پیش آئے تو ضرور لطف اندوز ہوگا۔ سلامت رہیں۔

اگر تھک جائیں نوحہ گر ہمارے
تو بول اُٹھیں علی اصغر ہمارے

نہایت بلیغ شعر۔ اُس جانکاہ المیے کا ایسا جامع اظہار...... سبحان اللہ۔ یہاں ''چیخ اُٹھیں'' نہ کہہ کر

"مبول اٹھیں" فصاحت ہے اور یہ تاثر دینے کی سعی ہے کہ نوحہ کناں بیبیاں نڈھال ہونے لگتی ہیں تو معصوم کے رونے کی آواز ابھرتی ہے۔گویا کہہ رہے ہوں، یہ آوازِ گریہ مدھم کیوں ہوئی ؟اور پھر نوحے کی شدت میں اضافہ ہوجاتا ہے۔کس سلیقے سے غم بیان کیا ہے۔تسلیم نیازی بھائی......سلامت رہیں۔

رؤف رضا (دہلی)

تسلیم بھائی!بہت خوب۔آپ نے پہلے تو زمین کومشکل بنایا پھر اُس کی سنگلاخی کوحتی الامکان پانی کردیا۔یہ صلاحیت اور مشقت آج کے عہد میں خال خال ہی نظر آتی ہے۔بہت مبارکباد۔

چونکہ آپ سے خلوص کا رشتہ ہے سو اِس سے آگے کی بعض secondary باتوں پر مشورہ کرنا چاہوں گا۔

بو رہے ہیں حروفِ قند و شکر
لہجہ ہائے کرخت کٹ رہے ہیں

شعر میں کاٹ رہے ہیں کا تقاضہ تھا۔لیکن ردیف میں کٹ رہے ہیں آیا ہے لہٰذا اِس مجبوری کو بو رہے ہیں کی جگہ بوئے جا رہے ہیں کہہ کر نبٹا جا سکتا تھا۔یہ میرا ذاتی خیال ہے۔اِس سے اتفاق لازمی نہیں۔البتہ غزل اپنی جگہ عمدہ ہی ہے۔اِس میں دو رائے نہیں۔...... آپ کی یہ بات مجھے پسند ہے کہ آپ تجربہ کرتے ہیں اور اپنی مقبولیت کو خطرے میں ڈالتے رہتے ہیں۔

پروفیسر ارشد عبدالحمید (صدر شعبہ اردو، گورنمنٹ پی جی کالج، ٹونک)

مدتوں سے رکا ہُوا ہے سفر
روز و شب زاد و رخت کٹ رہے ہیں

لاجواب......مشکل پسندی تو جیسے آپ کی فطرت میں شامل ہے۔ڈھیروں داد۔

داور نوید

آپ کی شاعری کا توڑ نہیں ہے۔میں آپ سے بہت متاثر ہوں۔سلامت رہیں۔

نثار احمد (دھنباد، جھارکھنڈ)

تسلیم نیازی معاصر اردو ادب کا ایک باکمال شاعر ہے۔ردیف کو پوری غزل میں جس تخلیقی ہنر مندی سے سنبھالا ہے وہ عام شاعر کے بس کی بات نہیں۔انہوں نے اختراعی ذہن پایا ہے۔منفرد ڈکشن کے لئے تسلیم کو ڈھیروں داد۔

شمیم قاسمی (پٹنہ)

تسلیم نیازی کی تخلیق کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ وہ ایک فطری شاعر ہیں۔کہا جاتا ہے کہ شاعری دراصل تتلی کے نازک پروں پر پیغام لکھنے کے مترادف ہے۔جس طرح تتلی کے پروں پر پیغام لکھنا کٹھن ہے ٹھیک اُسی طرح شاعری بھی نازک اور سخت مرحلہ ہے۔لیکن اِس سخت مرحلے کو آسانی سے طے کرنے والے شاعر کا نام ہے تسلیم نیازی۔

امتیاز احمد انصاری، آسنسول

Beautiful,wonderful,extraordinary,nice and stupendous. Really I don't have words to express your works. Keep it up

Anwarul Haque
Asst. teacher RK mission School
Purulia(West Bengal)

دل کا وہ حال کہ اب رنگ نہ خوشبو موجود
اِس خرابے میں مگر آج تلک تو موجود

لاجواب، بے مثال، جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

ملک زادہ جاوید

اچھی شاعری۔آپ کولفظوں کے برتنے کا ہنر آتا ہے۔

خورشید احمد کاکوی

واہ نیازی صاحب واہ!

کیسی کیسی سنگلاخ زمینوں کو آپ پانی کرتے رہتے ہیں۔

ارشد جمال حشمی

اب اجتہاد بھی تھوڑا بہت ضروری ہے

مری غزل، رہے اک قافیہ غلط تجھ میں

واہ، غلط کو کس خوبصورتی کے ساتھ صحیح کر دیا ہے عمدہ شعر کہکر۔ بہت خوب۔

شمیم فاروقی

جو عشق وشق کبھی پیار ویار میں نہ رہا

وہ میری طرح کبھی اشتہار میں نہ رہا

جناب تسلیم نیازی صاحب، کیا خوبصورت غزل ہے۔خاص کر مطلع میں جس خوبصورتی

سے آپ نے روزمرہ کے الفاظ کا استعمال کیا ہے وہ ہر کسی کے بس کا روگ نہیں ہے

افتخار شاہد ابوسعد (پاکستان)

آپ کا منفرد اسلوب، مضامینِ نو کی فراوانی آپ کے کلام کو نمایاں مقام عطا کرتی ہیں۔ہر شعر نئے مضامین کے ساتھ۔ہر شعر چونکانے والا۔واہ!!!

تسنیم جوہر (حیدرآباد دکن)

تسلیم نیازی سرزمینِ مغربی بنگال میں ایک توانا اور منفرد آواز ہے۔اللہ انہیں سلامت رکھے!

دلشاد نظمی (جمشید پور، ٹاٹا)

عرض پارہ

میں اس زمانے میں بھی شعر کہتا تھا اور اسی انہماک سے کہتا تھا جب میرے پاس کوئی سامع یا کوئی قاری موجود نہیں تھا۔ آج بھی وہ انہماک قایم ہے۔ تخلیق کرنا اور خود اُس سے گھنٹوں محظوظ ہونا یہی میرے لئے شاعری کا ماحصل ہے۔ بقیہ تمام چیزیں آفرینش سے ہی میرے نزدیک ثانوی حیثیت کی حامل رہی ہیں۔ جیسے کوئی چوپایہ ماں بچے جنتے ہی اُسے چومنے چاٹنے لگ جاتی ہے۔ کچھ لوگ اگر میری شاعری کو پسند کرتے ہیں تو اِس میں خود اُن کے ذوقِ جمالیات کا قصور ہے۔ میں اِس کا ذمہ دار نہیں۔ مصنوعات کے معیار پر اشتہار کو اہمیت دینے والے صارفیت زدہ ماحول سے شعر و ادب بھی بے اثر نہیں رہ سکا ہے۔ یہاں بھی تخلیق پر تبلیغ کو فوقیت حاصل ہے۔ تخیل سے زیادہ تعلق اور تملق پر تکیہ کیا جاتا ہے۔ جہاں تک میرا معاملہ ہے تو میں بھی کوئی آسمان سے اتارا گیا نہیں ہوں۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ میں کوئی درویش منش انسان ہوں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ میں بچپن سے ہی کافی شرمیلی طبیعت کا واقع رہا ہوں۔ بھیڑ بھاڑ سے گھبراہٹ ہوتی ہے۔ ذہانت میں کمی نہیں تھی۔ لیکن اسکول میں بھی میں بیک بنچی ہی تھا۔ پچاس کا ہونے کو آیا ہوں۔ لیکن فطرت آج بھی نہیں بدلی ہے۔ گھڑے بنا لیتا ہوں۔ لیکن انہیں بازار میں فروخت کرنا مجھے نہیں آتا ہے۔ میں اسے اپنی شخصیت کے ایک بہت بڑے نقص سے تعبیر کرتا ہوں۔ میں اسے خودداری نہیں کمزوری سمجھتا ہوں۔ جس پر قابو پانے کی حتی الوسع کوشش بھی کرتا رہتا ہوں۔ لیکن مطلب براری، تعلق سازی، خوشامد اور گھس پیٹ جیسی چیزیں مجھے خوش آتیں ہی نہیں اور آتیں بھی نہیں۔ میرا پہلا شعری مجموعہ ''ڈالفن'' 1992 میں منظرِ عام پر آیا تھا۔ دوسری کتاب ''لہو شعر (دیوانِ تسلیم نیازی)'' 2012 میں شائع ہوئی تھی۔ ''جی خراب رہتا ہے'' میری تیسری کتاب ہے۔ میں تینوں کتابوں کی اشاعت میں تعاون کے لئے اپنے کرم فرماؤں کا بے انتہا ممنون ہوں۔

تسلیم نیازی

مٹی فقیر کی، مرا گارا فقیر کا
میں کیا، مرا تو سارے کا سارا فقیر کا

کچھ رنج بچ رہے تھے تو سہنے کے واسطے
مجھ میں ہوا نزول دوبارہ فقیر کا

بستی کے سارے لوگ تو سنتے رہے اذان
سمجھا کہاں کسی نے اشارہ فقیر کا

تر دامنی پہ میری ملامت نہ کیجئے
بگڑوں مجال ہے، میں سنوارا فقیر کا

تفتیش کر رہے ہیں جنابِ فقیہہ شہر
کس طور ہو رہا ہے گزارہ فقیر کا

کرتے ہیں شہر میں جو تجارت لباس کی
وہ بھی پہن رہے ہیں اتارا فقیر کا

کرتا ہے چھیڑ چھاڑ زمانے، فقیر سے
چڑھتا نہیں ہے خیر سے پارا فقیر کا

تسلیم، یوں میں ناچوں کہ زنجیر توڑ لوں
اُس کو اگر ہو رقص گوارہ فقیر کا

لے گا مقام کیا کوئی ٹیلا پہاڑ کا
دامن ہزار رہتا ہو گیلا پہاڑ کا

کچھ اونٹ نیچے آئے انہوں نے ہی یہ کہا
"چہرہ پڑا ہے خوف سے پیلا پہاڑ کا"

موذی ندی نے کاٹا ہے اِس طور سے کہ اف
چہرہ پڑا ہے زہر سے نیلا پہاڑ کا

بیعت نہیں قبول کسی خاک زاد کی
ہے آسماں نژاد قبیلہ پہاڑ کا

ہونا ہے فیضیاب تو خود آیئے قریب
چلنا نہیں ہے وصفِ اصیلہ پہاڑ کا

سینے کو اُس سے دور بھی حاصل ہے اُس کا درد
اِس غار میں پڑا ہے وسیلہ پہاڑ کا

آنکھ بے نور بھی نہیں مرشد
کوئی منظور بھی نہیں مرشد

کون رِستا ہے میری آنکھوں سے
کوئی ناسور بھی نہیں مرشد

آگ کی ہے اشد ضرورت بھی
سامنے طُور بھی نہیں مرشد

لوگ دن رات پیتے رہتے ہیں
اور مخمور بھی نہیں مرشد

جبر بھی سہہ رہے ہیں برسوں سے
اور مجبور بھی نہیں مرشد

اُس سے مِلنا بھی سخت مشکل ہے
اور وہ دور بھی نہیں مرشد

خود سے آگاہ بھی نیازیؔ ہے
اور مغرور بھی نہیں مرشد

جس کے ہاتھوں میں ہے بخشندہ ہنر درویش کا
اب اُسی کی نوکِ خنجر پر ہے سر درویش کا

آپ نے دیکھی کہاں ہے دوپہر درویش کی
آپ پر تو سایہ افگن ہے شجر درویش کا

اِس اندھیری کوٹھری میں بھی مجھے آرام ہے
شیخ کا چھوٹا سا دل ہے مستقر درویش کا

کچھ زیادہ بھی نہیں قیمت مرے دیوان کی
مفت میں کیوں مانگیے خونِ جگر درویش کا

پردہ پوشی کی روایت آپ سے منسوب ہے
ہے جہاں کے سامنے ہر خشک و تر درویش کا

میں کہاں تسلیم بھائی اور کہاں شعروسخن
راہ شاہنشاہ کی، زحمتِ سفر درویش کا

اگر تھک جائیں نوحہ گر ہمارے
تو بول اُٹھیں علی اصغر ہمارے

مصیبت جب بھی آئی آسماں پر
ہوئے نیزوں پہ روشن سر ہمارے

کہیں پرواز کرتے ہیں مویشی!
تمہاری پشت پر ہیں پر ہمارے

بنی ہے دشت میں سرکارِ گرگاں
کہاں بیٹھے ہیں شیرِ نر ہمارے

لگا رکھا ہے چہرے پر تبسم
اداسی آ نہ ٹپکے گھر ہمارے

غمِ جاناں ہی ہم کو وجہِ خواری
یہی اسبابِ کرّوفر ہمارے

اگر مجذوب سے ڈرتے نہیں ہو
تو پھر آؤ کبھی اندر ہمارے

خط کو جب اُس نے موڑ کے نیفے میں رکھ لیا
میں نے اُس ایک پل کو کلیجے میں رکھ لیا

رکنا نہ تھا مزید سو چھت سے اتار کر
بھیگی ہوئی قمیص کو تھیلے میں رکھ لیا

خوشبو مرے مشام کے حصے میں آ گئی
رنگوں کو اُس نے اپنے سراپے میں رکھ لیا

اب دیکھنے لگا ہوں میں آنکھوں کو موند کر
ماضی کو میں نے حال کے صیغے میں رکھ لیا

کھینچا بھی اپنے گرد بغاوت کا دائرہ
دنیا کو بھی معاً اُسی گھیرے میں رکھ لیا

کم عمر خواہشوں کا تقاضا شدید تھا
سورج کو ہی چراغ کے دھوکے میں رکھ لیا

اُس ایک شخص سے مِلنا ملانا ختم ہوا
اب آسماں پہ مرا آنا جانا ختم ہوا

نہ اُس سے ترکِ تعلق ہوا نہ عہدِ وفا
اک انتظار کہ جاری رہا نہ ختم ہوا

ابھی تو دل سے اُسے آنکھ میں اتارا ہی تھا
کہ ایک پل بھی نہ گزرا، زمانہ ختم ہوا

میں اپنے آپ میں کم بھی نہ تھا مگر خود کو
کسی پہ اِتنا لٹایا، خزانہ ختم ہوا

جو ایسا ہے تو زمانے، بس اب خدا حافظ
ترے یہاں سے مرا آب و دانہ ختم ہوا

تم اگر ناقۂ دل پر نہ سواری کرتے
ہم بھی صحرا میں کہیں وقت گزاری کرتے

ہیں فقیری میں سو حسرت پہ ہی کافی ہوئے ہیں
بادشہ ہوتے تو فرمان نہ جاری کرتے

چھوڑ دیتی مری دیوار پہ آنا جانا
چاندنی سے جو کبھی بات تمہاری کرتے

ہم کو بے وقت انگیٹھی میں نہ ڈالا جاتا
تم جو موسم کی طرح فکر ہماری کرتے

ہجرسے ہم کو نکلنا نہیں ورنہ ہم بھی
اشک پیمائی کبھی زخم شماری کرتے

شعرگوئی نے زمانے پہ ہمیں کھول دیا
اچھا ہوتا کہ ہم افسانہ نگاری کرتے

جب زمانہ مری چہکار تک آجائے گا
مرحلہ پنجہ و منقار تک آجائے گا

سرحدِ ضبط سے نکلے تو کبھی عرصۂ ہجر
لفظ خود نقطۂ اظہار تک آجائے گا

بس ترے دھیان میں جانے کی ضرورت ہے مجھے
کاغذی پھول بھی مہکار تک آجائے گا

یہ قلم جوشِ بلاغت میں جہاں تک جائے
گھوم کر پھر لب و رخسار تک آجائے گا

خواب آنکھوں سے کبھی دور نہیں رہ سکتے
چاند ہوگا تو وہ دیوار تک آجائے گا

عشق ہے، فرد کو مجبور نہیں کرسکتا
جس کو جلنا ہے خود انگار تک آجائے گا

تم نے چاہا ہے سو پتھر بھی نہیں ہے درپیش
تم جو چاہوگے تو کہسار تک آ جائے گا

آنکھ تو رونقِ بازار پہ رک جاتی ہے
بات تو درہم و دینار پہ رک جاتی ہے
صلح کرنے سے تنازعے کبھی بڑھ جاتے ہیں
اور لڑائی کبھی تلوار پہ رک جاتی ہے
حوصلے ہیں کہ افق پار سے ہو آتے ہیں
اور جبیں ہے کہ یہ دیوار پہ رک جاتی ہے
توڑلوں اُس کو اگر سامنے دنیا نہیں آئے
میری انگلی تو اِسی خار پہ رک جاتی ہے
کچھ تو ہے گردشِ ایام سے رشتہ اُس کا
ورنہ یہ کیوں میرے اصرار پہ رک جاتی ہے
ذہن کو اُس کے خیالات سے فرصت ہی نہیں
ہر کہانی اُسی کردار پہ رک جاتی ہے
اُس کے آگے میرے اشعار کی قیمت ہی کیا
سانس جس شخص کی گفتار پہ، رک جاتی ہے

جب تک نہ ہو اشعار کی شدبد، نہیں کرتے
الفاظ پہ اس طرح تشدد نہیں کرتے
درپیش تھی تنگیِ قوافی سو کیا ہے
ہم کارِ روایت شکنی خود نہیں کرتے
بھیگے ہیں، کسی روز تو سوکھیں گے پروبال
اے عاجزِ پرواز، تردد نہیں کرتے
بوسوں کی جاگہہ ہونٹوں پہ اُس کے تھی یہ تنبیہ
مغرب کا عمل وقتِ تہجد نہیں کرتے
تسلیم جی، آنکھیں اب اُسے ڈھونڈ بھی لیں تو
شاہیں جو کیا کرتے تھے ہدہد نہیں کرتے

باغِ دل میں درخت کٹ رہے ہیں
دن پرندوں کے سخت کٹ رہے ہیں

یوں سمجھئے کہ سانس چل رہی ہے
راستے لخت لخت کٹ رہے ہیں

ساری دنیا تو پھول پھل رہی ہے
ہم ترے نیک بخت کٹ رہے ہیں

مدتوں سے رکا ہوا ہے سفر
روزوشب زاد ورخت کٹ رہے ہیں

بو رہے ہیں حروفِ قند و شکر
لہجہ ہائے کرخت کٹ رہے ہیں

اپنی کوفے میں خاک کٹ رہی ہے
شام میں تاج وتخت کٹ رہے ہیں

میں جو دیوانہ وار ناچ اٹھا
سارا دار و مدار ناچ اٹھا

اک ذرا نم ہوئی کہ مٹی میں
نقشِ آئندہ کار ناچ اٹھا

اے زمانے ترے اشارے پر
میں کبھی ایک بار ناچ اٹھا

ناچ اجسامِ چرخ ناچتے ہیں
تو کیوں اے خاکسار ناچ اٹھا

ابتدا یہ کہ میری جان گئی
انتہا یہ کہ یار ناچ اٹھا

رقصِ بسمل نے وہ فضا باندھی
قاتلِ خون خوار ناچ اٹھا

ایک تم ہی نہیں اٹھے تسلیم
ورنہ ہر خشت و خار ناچ اٹھا

کسی کے سینے میں دل کا سراغ بھی نہیں ہے
اگرچہ عشق میں کارِ دماغ بھی نہیں ہے
زمانہ تھا تو ترا ساتھ بھی میسر تھا
ہوا نہیں ہے تو اکیلے چراغ بھی نہیں ہے
مجھے پتا ہے میں اب تجھ میں اک ذرا بھی نہیں
یہ زخم ایسا بھرا ہے کہ داغ بھی نہیں ہے
مکیں نہیں ہے تو کیسا کھنڈر ہوا ہے مکان
اگر بہار نہیں ہے تو باغ بھی نہیں ہے
نہ حوصلہ ہے مری جاں نہ بازیاب ہے تو
شراب بھی نہیں حاضر، ایاغ بھی نہیں ہے

کہیں بھی جبر کہیں زور ہے، نہیں ہے نا
کوئی صدا ہے، کوئی شور ہے، نہیں ہے نا
میں ناچتا ہوں تو اپنی رضا سے ناچتا ہوں
مری کمر میں کوئی ڈور ہے، نہیں ہے نا
لگے ہوئے ہیں سبھی قوم کی قیادت میں
کوئی لٹیرا، کوئی چور ہے، نہیں ہے نا
ہری بھری مرے دل کی فضا تھی جب تم تھے
اب اِس چمن میں کوئی مور ہے، نہیں ہے نا
تمہی کہو کہ بچھڑنے کے بعد بھی جاناں
وہی ہے رات، وہی بھور ہے، نہیں ہے نا

ہم نہ موتی میں نہ مرجان میں رکھے ہوئے ہیں
ہم تو پاسنگ ہیں میزان میں رکھے ہوئے ہیں

یہ زمیں اب بھی وہیں ہے جہاں رکھی گئی تھی
ہم بھی کیا اب بھی ترے دھیان میں رکھے ہوئے ہیں

نامناسب ہے مگر تجھ سے ملاقات کو ہم
آج بھی زمرۂ امکان میں رکھے ہوئے ہیں

مسکراہٹ مرے رخ پر کبھی مرجھاتی نہیں
کاغذی پھول ہیں گلدان میں رکھے ہوئے ہیں

حالتِ وجد میں دیتے ہیں دکھائی یہ مجھے
کچھ مناظر مرے وجدان میں رکھے ہوئے ہیں

جان ہی تک ہے زمانے کی رسائی مری جان
ہم تجھے اِس لئے ہیجان میں رکھے ہوئے ہیں

شعر ہے، آپ نے تسلیم جو کہہ رکھا ہے
شعر تو میرؔ کے دیوان میں رکھے ہوئے ہیں

سفر میں اُس کو ساتھی چاہیئے تھا
مگر کیا مجھ سا خبطی چاہیئے تھا

اِس استحقاق سے گھبرا گیا میں
اُسے ہر وقت میں ہی چاہیئے تھا

مجھے کرنی تھی موجوں سے لڑائی
اُسے تو صرف موتی چاہیئے تھا

مجھے بھی اُس کے 'رُخ' کی تھی ضرورت
اُسے بھی میرا 'ہاتھ' چاہیئے تھا

نہ اُس کی راہ سے ہٹنا تھا مجھ کو
نہ عذرِ پیش گامی چاہیئے تھا

تمہیں تا دیر جلنا تھا چراغو
ہوا سے ربط رسمی چاہیئے تھا

یہاں کِس کِس کو خوش آتا وہ تنہا
ہر اِک پیاسے کو پانی چاہیئے تھا

یہاں تو حق بیانی تھی ضروری
یہاں تو بس نیازیؔ چاہیئے تھا

تیری تحسین، تری داد میں ڈالا گیا ہے
مجھ کو بھی تجھ "سخن آباد" میں ڈالا گیا ہے

فقروفاقہ میری بنیاد میں ڈالا گیا ہے
بقیہ جو کچھ بھی ہے وہ بعد میں ڈالا گیا ہے

عشق میں وصل کے لحات بھی رکھے گئے ہیں
یعنی ایمان کو الحاد میں ڈالا گیا ہے

حرص والے تو ملاقات میں رکھے گئے ہیں
اور فقیروں کو تری یاد میں ڈالا گیا ہے

مجھ کو تیشے کی سہولت بھی نہیں ہے حاصل
اور پھر پیشۂ فرہاد میں ڈالا گیا ہے

آپ جیسوں کی قرابت میں بٹھایا گیا میں
گویا اک صفر کو اعداد میں ڈالا گیا ہے

کس نے پھر جرأتِ اظہار پہ باندھی ہے کمر
کس کو پھر آتشِ افتاد میں ڈالا گیا ہے

وہ تو آنند کی نگیا میں اتارے گئے تھے
گاؤزادوں کو تو "اُنماد" میں ڈالا گیا ہے

سب ایک آدھ وقت کے، رازق نہیں کوئی
اس جا کسی کا والدِ مشفق نہیں کوئی

یارب شعارِ حسن پرستی کی خیر ہو
سب بوالہوس ہیں شہر میں، عاشق نہیں کوئی

دفعاتِ غم ہزار ہیں دستورِ عشق میں
اے دوستو، خوشی کی مگر شِق نہیں کوئی

تم آگئے تھے یاد سو گرما گیا بدن
یونہی سا ہے بخار، تپ دق نہیں کوئی

دل سے بھی رسم وراہ، جہاں سے بھی دوستی
تسلیم تیرے جیسا منافق نہیں کوئی

تم کو تو ہورہا ہے زمانے سے فائدہ
جانے دو، چھوڑو، بات بڑھانے سے فائدہ

یہ عشق اور وفا ہیں تباہی کے والدین
بے وجہ ان کو سر پہ بٹھانے سے فائدہ

مٹی میں تھی نمی تو پکارا بہت اُسے
اب خشک سایوں میں بلانے سے فائدہ

دن رات بھاگ دوڑ، خوشامد، فریب، جھوٹ
اِن قیمتوں پہ اُس کو بھلانے سے فائدہ

تم کو ضرور اس کی دعاؤں سے ہے غرض
درویش کو تمہارے خزانے سے فائدہ

رکھتا ہوں خود کو اپنی حقیقت سے آشنا
تسلیم دوسرے کے فسانے سے فائدہ

اِس لئے رکھ رکھاؤ سانسوں کا
اُس کی زلفیں پڑاؤ سانسوں کا

اِک ذرا سا خیال پر ہی دھمال
اف یہ اُس سے لگاؤ سانسوں کا

اُس کا قصہ سنا رہا ہے دل
جل رہا ہے الاؤ سانسوں کا

غم کو جب مجھ سے کچھ نہیں ملتا
چاٹ جاتا ہے گھاؤ سانسوں کا

عشق کا بار جو اٹھا نہ سکے
سہہ رہے ہیں دباؤ سانسوں کا

بہکے بہکے قدم طبیعت کے
بدلا بدلا سُبھاؤ سانسوں کا

عشق باربار بھی نہیں ہوا
اور انتظار بھی نہیں ہوا
عمر بھر کھلی رہی دکانِ دل
اور کاروبار بھی نہیں ہوا
کھاچکا ہزاربار ٹھوکریں
اور ہوشیار بھی نہیں ہوا
مجھ کو تو امیدِ اعتراف تھی
اور مرا شمار بھی نہیں ہوا

دل مرا مچان بھی رہا نہیں
اور کبھی کچھار بھی نہیں ہوا
اب شراب چھوڑنے کو ہے مجھے
آج تو خمار بھی نہیں ہوا
اشک آبشار بھی نہیں ہوئے
درد کوہسار بھی نہیں ہوا
حرف حرف حالِ دل ہوا بیاں
اور اشتہار بھی نہیں ہوا

سائباں نہیں ہے کیا
آسماں نہیں ہے کیا
جی خراب رہتا ہے
تو یہاں نہیں ہے کیا
ڈھونڈنے کی عادت ہے
یوں کہاں نہیں ہے کیا
عشق مفلسی میں بھی
نقدِ جاں نہیں ہے کیا
رات بھی منڈیروں پر
آشیاں نہیں ہے کیا
ایسے چپ نہیں رہتے
اے، زباں نہیں ہے کیا

ریت میں گڑے کیوں ہو
بادباں نہیں ہے کیا
باغ میں ہے خوش حالی
باغباں نہیں ہے کیا
آپ کے لغت میں بھی
لفظِ ہاں نہیں ہے کیا
یار سگ سے ڈرتے ہیں
استخواں نہیں ہے کیا
ڈر رہے ہو دوزخ سے
گھر میں ماں نہیں ہے کیا

یہ زمیں ایک پیالے سے زیادہ نہیں کچھ
اِس میں پانی مرے چھالے سے زیادہ نہیں کچھ

اے غمِ گردشِ دوراں تو ڈراتا ہے مجھے
تو مرے ایک نوالے سے زیادہ نہیں کچھ

بے مکانی سے بڑی کوئی مصیبت ہی نہیں
مکڑیوں کے لئے جالے سے زیادہ نہیں کچھ

ڈوبنے والے کو شاید یہ پتا ہی نہیں تھا
میں بھی اک دیکھنے والے سے زیادہ نہیں کچھ

میرے اُس دوست کو مطلوب ہے جادوئی چراغ
اور مرے پاس اجالے سے زیادہ نہیں کچھ

سوچیئے تو ہے سمندر سے بھی گہرا تسلیم
دیکھیئے تو ندی نالے سے زیادہ نہیں کچھ

تجھے رکھوں کہاں اے پورنماشی
اندھیرے کرتے ہیں خانہ تلاشی

بدن سنتا ہے اب بھی تیری خوشبو
ہوس کو آتی ہے پیکرتراشی

یہ تیری آگ ہے جلتی رہے گی
زمانہ لاکھ کرلے آبپاشی

مجھے ہے لب کشائی کی تمنا
اگر ہوتی نہ اُس کی دل خراشی

اگر اُس نے نہیں تو اور کس نے
کہا، "آمی تو ماکے بھالو باشی!"

چلو تسلیم جی، ہو جائیں ہم بھی
کسی صاحب بہادر کے اتاشی

وہ آیا بھی تو کب آیا نیازیؔ
جب آئی نوبتِ کعبہ و کاشی

اُس کے غم سے دست برداری، نہیں!
جنگ میں نے اِس قدر ہاری نہیں

کچھ تو ہے ترکِ تعلق کا اثر
لاکھ کہہ لیں- کوئی دشواری نہیں

مجھ پہ ہیں اُس کی کرم فرمائیاں
ڈھیر ساری ہیں مگر ساری نہیں

بوجھ اگر زخموں کا دل پر ہے تو ہے
گُل یہ میرے شاخ پر بھاری نہیں

مان لیتے ہیں کہا تقدیر کا
یہ شکیبائی ہے، لاچاری نہیں

لوگ سر دُھنتے ہیں میرے شعر پر
اور پھر کہتے ہیں - معیاری نہیں

کہیں دغا، کہیں میری مخالفت ہوئی ہے
کسان خوش ہے کہ اچھی مزارعت ہوئی ہے

اِسی لئے میں کسی سے بھی اب نہیں لڑتا
کہ جب بھی جنگ ہوئی ہے مصالحت ہوئی ہے

تمہاری زلف سے نکلے تو غم بدوش ہوئے
نہ کچھ زیاں ہی ہوا ہے، نہ کچھ بچت ہوئی ہے

میں اُس کے آنے سے پہلے پڑا تھا بے چارہ
کہ عینِ موسمِ بارش میں سر پہ چھت ہوئی ہے

پڑھی نہ تھی تو محبت تھی " اردو کی پہلی "
مگر میں پڑھنے لگا ہوں تو یہ لعنت ہوئی ہے

گناہِ عشق میں جاں بچ گئی تو دل سے گئے
اگر قصاص سے چھوٹے ہیں تو دِیَت ہوئی ہے

رات دن غرقِ خیالِ یار رہنے کے لئے
آپ سے کس نے کہا بیمار رہنے کے لئے

کر گزرتا وار اگر وہ دوسرا ہوتا کوئی
دوست تھا سو کہہ گیا تیار رہنے کے لئے

حق بیانی ہو چکی، اب چھوڑیئے، بس کیجئے
اتنا کافی ہے ذلیل و خوار رہنے کے لئے

میں نے تو اکثر سفر کی ابتدا سے قبل ہی
راستوں سے کہہ دیا دشوار رہنے کے لئے

بھائیوں کا ساتھ رہنا جب سے مشکل ہوگیا
آگئی آنگن میں اِک دیوار رہنے کے لئے

جنگلوں کو شہر نے دیوار میں چنوا دیا
اب کہاں جائیں گے یہ اشجار رہنے کے لئے

صلح کی خاطر گیا تسلیم، لے کر آگیا
کچھ بہانے برسرِ پیکار رہنے کے لئے

ساقیا دے شراب، تھک چکے ہیں
آج ہم بے حساب تھک چکے ہیں

آج رہنے دے خود فراموشی
پھر کبھی احتساب، تھک چکے ہیں

تم بھی آخر سفر سے اوب گئے
ہم بھی اے ہم رکاب تھک چکے ہیں

اب تو مجھ پر اتر اتر کے میاں
آسمانی عذاب تھک چکے ہیں

ہم بدلنے پہ ہی نہیں مائل
ورنہ کیا انقلاب تھک چکے ہیں

آنکھ اب بند ہی نہیں ہوتی
ورنہ کیا سارے خواب تھک چکے ہیں
ساری دنیا ہے تازہ دم اب بھی
ہم ہی خانہ خراب تھک چکے ہیں
ہم اور اُن کی جفا سے دامن کش
حق تو یہ ہے، جناب تھک چکے ہیں
ہم تو اِس دم پچاس کے بھی نہیں
عین وقتِ شباب تھک چکے ہیں

یونہی جینا محال ہوگیا ہے
بے خبر، ایک سال ہوگیا ہے
اتنی شدت سے ہم عبث ہی ملے
ہجر کا احتمال ہوگیا ہے
بی ہوس آج کل اکیلی ہیں
عشق جی کا وصال ہوگیا ہے
اس کے بارے میں اب نہ پوچھے کوئی
زخم کا اندمال ہوگیا ہے
وہ بھی زندہ ہے، میں بھی زندہ ہوں
کام سب حسبِ حال ہوگیا ہے
آدمیت کو پیش ہے فاقہ
آدمی مالا مال ہوگیا ہے
مچھلیاں اب کہاں قیام کریں
سارا پانی ہی جال ہوگیا ہے

اگر تجھ پر نہ جاں وارے نیازیؔ
ترے تو ہیں بہت سارے نیازیؔ

وہ میرے سامنے غیروں سے مل کر
مری غیرت کو للکارے نیازیؔ

تمہیں کیا دودھ کی حاجت نہیں ہے
تو کیوں روتے نہیں پیارے نیازیؔ

ضمیر اپنا، وہیں پھر دل بھی اپنا
کسے چھوڑے، کسے مارے نیازیؔ

ستمگر آ بھی سکتا ہے، نہیں بھی
گنوں یا توڑلوں تارے نیازیؔ

جہاں سب کشتیوں سے پار اترے
مجھے لے کر گئے دھارے نیازیؔ

اِکھونو چوکھ دوٹی بندو کورے
توماکے دیکھتے پارے نیازیؔ

منظوم ترجمہ

ابھی بھی دونوں آنکھیں بند کر کے
تمہیں جب چاہے دیدارے نیازیؔ

رنگ و بو کو میرا معمول سمجھنے لگے ہیں
زخم کو مور و مگس پھول سمجھنے لگے ہیں

ریت سے ہم کو نکل آئے زمانہ ہوا ہے
ہم تو موجوں کو ہی مستول سمجھنے لگے ہیں

میں نے کب کام کیا ہے تیری طاعت کے سوا
لوگ ناحق مجھے مشغول سمجھنے لگے ہیں

میں ترا حاشیہ بردار ہوا ہوں جب سے
شہر والے مجھے معقول سمجھنے لگے ہیں

خواب اب آنکھوں میں آتے ہوئے گھبراتے نہیں
بچے اسکول کو اسکول سمجھنے لگے ہیں

آپ کرتے ہیں نیازؔی تو کریں عشق مگر
لوگ اس کام کو اب بھول سمجھنے لگے ہیں

اتنے بھی رائگاں نہیں ہوئے ہیں
ہم ابھی آسماں نہیں ہوئے ہیں

صبر کے پھل ہنوز ہیں کچے
زخم ابھی خونچکاں نہیں ہوئے ہیں

بجھ نہ جائے الاؤ سانسوں کا
سارے قصے بیاں نہیں ہوئے ہیں

فکر کے شور و غل سے کیا ہوگا
لفظ اب تک اذاں نہیں ہوئے ہیں

ہم ہوا کی مدد سے ہیں روشن
طاقچوں پر گراں نہیں ہوئے ہیں

غم کا اظہار کرکے دم لیں گے
اب اُسے خوار کرکے دم لیں گے
اُس کو رسوا نہیں کیا ہے کبھی
مگر اِس بار کرکے دم لیں گے
اپنی موجوں پہ ناز ہے اُس کو
ہم اُسے پار کرکے دم لیں گے
دل کو مسجد بنا رہے ہو میاں
لوگ مسمار کرکے دم لیں گے
آپ چھپ لیں ہزار پردوں میں
ہم تو دیدار کرکے دم لیں گے
ڈھول دھپا کریں گے وہ پہروں
اور پھر پیار کرکے دم لیں گے

ہم پر تو وہ ناحق ہی کماں تانے ہوئے ہیں
ہم اُن کے خلاف اٹھیں گے، دیوانے ہوئے ہیں
اب کچھ بھی کریں آپ تو حیرت نہیں ہوتی
انداز سبھی آپ کے پہچانے ہوئے ہیں
منہہ سے مرے نکلیں تو برا مان گئے وہ
جن باتوں کے پہلے سے ہی افسانے ہوئے ہیں
اے گردشِ دوراں تری شہہ پر مرے اپنے
ملتے ہیں اب اِس طرح کہ بیگانے ہوئے ہیں
افسوس کہ اِس شہر میں تسلیم نیازی
انجان ہیں وہ بھی جو مجھے جانے ہوئے ہیں

فیس بک کی حسیناؤں کی نذر!

ہماری ٹیگ کوئی اُس کی وال تک پہونچے
کبھی تو شوقِ مسلسل کمال تک پہونچے
میں پوسٹ کچھ بھی کروں اور وہ شیئر کرلے
کبھی تو کوئی تمنا مآل تک پہونچے
کبھی تو چیٹ پہ آکر کرے پہل کوئی
کبھی تو واقعہ کوئی مثال تک پہونچے
کسی سے عشق کی ہو ابتدا اور اِس کے بعد
یہ فیس بک سے نکل کر وصال تک پہونچے
کہ ہم تو آج بھی خودکو بچھائے بیٹھے ہیں
کوئی تو یوں ہو پرندہ کہ جال تک پہونچے

بدن آٹا ، نمک بھر جامہ زیبی
ابھی غاروں سے جوں آئی ہو بے بی
شُگر سے شیخ کو پرہیز باہر
مگر حجرے میں جائز ہے جلیبی
اُسے ہے آج بھی مجھ سے محبت
یہ خوش فہمی ہوئی یا خود فریبی
زمانے بھر سے ہے رشتہ تمہارا
مجھی سے بات کرتے ہو اُریبی
یہاں کے آپ کیا 'شاہِ جہاں' ہیں
تو پھر کیا آپ سے 'اورنگ زیبی'
میں حضرت آپ ہی سے ہوں مخاطب
کمینے، دوغلے، جھوٹے، فریبی

ضرر رسائیِ ہجر و وصال ہے؟ نہیں ہے
مری طرح ترا جینا محال ہے؟ نہیں ہے

ترا تو جھوٹی ستائش پہ ہو رہا ہے گزر
ترے درون ہنر ہے، کمال ہے؟ نہیں ہے

میں اُن کی سجدہ سرائی سے کر رہا ہوں گریز
مجھے ذرا سی بھی فکرِ مآل ہے؟ نہیں ہے

دلوں کی بات کو بہتر ہے درگزر کیا جائے
ہمارے پاس غنیمت کا مال ہے؟ نہیں ہے

وہ اختیار میں آیا تو بھول ہی گئے سب
کچھ امتیازِ حرام و حلال ہے؟ نہیں ہے

کسی کا شعر جو اچھا لگا ہو محفل میں
مری غزل بھی کوئی بے مثال ہے؟ نہیں ہے

تمام شہر ہے حیراں، کہاں گیا کمبخت
ترے یہاں بھی نیازؔی، کمال ہے، نہیں ہے

دیکھ کے ہم کو آپ بھی ایسے رو دیتے ہیں
ہم پر تو اکثر آئینے رو دیتے ہیں

خواہ مخواہ کا رونا دھونا ہم سے نہ ہوگا
آپ رُلاتے ہیں تو چلیئے رو دیتے ہیں

آنکھوں کو نہلا دیتے ہیں خواب تمہارے
کانٹوں سے ملتے ہی چھالے رو دیتے ہیں

اچھا ہے تم یاد نہیں آتے ہو ہم کو
ورنہ ہم جِس تِس کے آگے رو دیتے ہیں

موسمِ دل کی پیش بیانی پر مت جانا
لوگ تو اکثر ہنستے ہنستے رو دیتے ہیں

مجبوری میں ہم جو روئے تو کیا روئے
ایسے میں تو اچھے اچھے رو دیتے ہیں

آگ کو پانی نے بھڑکایا بہت
بھول کر وہ مجھکو یاد آیا بہت

ہے غضب کا ذائقہ اندر فریب
میں نے اِس پکوان کو کھایا بہت

چاہتے ہو تم یہی کافی ہے بس
اِس سے کیا مطلب کہ تھوڑا یا بہت

چھوڑ کر دنیا کسی کے عشق میں
میں نے تو کھویا ہے کم، پایا بہت

اِس قدر ہم بھی پیا کرتے نہ تھے
شیخ نے کیوں وعظ فرمایا بہت

یہ فقیروں کے لئے مخصوص ہے
شعر میں لگتا ہے سرمایہ بہت

چھوڑیئے تسلیم جی، بس کیجیے
ہل رہا ہے عرش کا پایہ بہت

کارگاہِ کوئے گلفام ہے، کیا کیجیے گا
خاکساری بھی تو اِک کام ہے، کیا کیجیے گا

چند کانٹے تو مرے دل میں نمو پا رہے ہیں
انہیں اِس باغ میں آرام ہے، کیا کیجیے گا

کبھی کوشش نہیں کرتے ہیں جو حق دینے کی
اُن سے ہی وعدۂ انعام ہے، کیا کیجیے گا

میرے جس متن کو محفل میں پڑھا بھی نہ گیا
اُس کے مطلب پہ ہی کہرام ہے، کیا کیجیے گا

دل تو شیطان کے پہلو میں کھڑا ہے جا کر
جسم باندھے ہوئے احرام ہے، کیا کیجیے گا

آدمی ہے کوئی تسلیم درندہ ہے کوئی
کوئی بد ہے کوئی بدنام ہے، کیا کیجیے گا

کیا گفتگو کروں میں زمانے کے باب پر

چشمہ تو چھوڑ آیا ہوں اُس کی کتاب پر

رنجشِ وصال زینتِ باغِ عدو رہا

مجھ سے مِلے تو پاؤں کو رکھ کر رکاب پر

ڈھلتے ہی شام رات کی رانی کے ہو رہے

دن بھر رہے نثار چمن میں گلاب پر

ایسے تو دن دہاڑے ہی جلنے لگے چراغ

ایسے خدا ہی رحم کرے آفتاب پر

بیٹھا ہوں شام ہی سے تیمّم کئے ہوئے

دل آگیا ہے ایک تہِ جُو آب پر

میرے اتر آنے کا اثر دِکھنے لگا ہے

احباب کی کشتی میں بھنور دِکھنے لگا ہے

شب بھر بھی نہ رہ پائے گی دیوارِ تحمّل

اِس میں تو سرِ شام ہی در دِکھنے لگا ہے

اب دشت نوردی کا ہے اللہ ہی نگہبان

دو دن بھی نہیں بیتے کہ گھر دِکھنے لگا ہے

ہر چند کہ چہرے پہ تھکن کے نہیں آثار

بالوں پہ مگر گردِ سفر دِکھنے لگا ہے

یونہی نہیں، تسلیم نیازی کی تو اِک عمر

مٹی میں ملی ہے تو ہنر دِکھنے لگا ہے

اک ہوس ناگزیر ہورہی ہے
خاک میری خمیر ہورہی ہے

فکرخانوں سے حرف زاروں تک
اُس کی خوشبو شہیر ہورہی ہے

بات نکلی ہے اُس کے ہونٹوں کی
شرحِ دیوانِ میر ہورہی ہے

کٹ رہاہے کوئی درخت کہیں
سانس میری صفیر ہورہی ہے

مرنے والے کی روح تڑپے گی
عشق سے داروگیر ہورہی ہے

بوریے سے زمیں پہ آپہنچی
اب فقیری امیر ہورہی ہے

کچے ہیں اِس کے زنداں سارے
یہ زمیں کِس پہ "ہیر" ہورہی ہے

تم بولنے ہی تک ہو کہ جانے کے سانپ تک
ہم تو ہیں آستیں میں بسانے کے سانپ تک

کچھ دوست کیا کہوں کہ دکھانے کے خوب پیار
پھر یہ کہ آستیں میں چھپانے کے سانپ تک

جن کو غرض ہے لعل و جواہر سے وہ رہیں
لیکن مجھے ہے جانا خزانے کے سانپ تک

آنکھوں کی اِس ترائی کا موسم بدل چکا
اب مور کیا، یہاں نہیں آنے کے سانپ تک

ہجرووصال کھیل رہا تھا کہ دفعتاً
سیڑھی سے آگیا میں زمانے کے سانپ تک

مجھ کو شرابِ ناب نہیں، چاہیئے تھا زہر
پہنچی مری طلب ترے شانے کے سانپ تک

باہر کے دشمنوں کا نیازی گلہ ہی کیا
پھن کاڑھتے ہیں مجھ پہ گھرانے کے سانپ تک

کہ عشق میں جو بدن پور تک نہیں گئے ہیں
وہ جھوٹ بولتے ہیں، روح چک نہیں گئے ہیں
عدم جنون ہے دراصل نامرادیِ عشق
یہ کیا کہ دشت میں ہیں اور بھٹک نہیں گئے ہیں
ستمگرانِ مضافات کو ہوا کیا ہے
اگرچہ کہہ تو رہے ہیں کہ تھک نہیں گئے ہیں
ابھی تو صبر و تحمل کا دور چل رہا ہے
ابھی تمام پیالے چھلک نہیں گئے ہیں
مرے سلیقۂ صیقل کا ہے کمال میاں
یہ سنگ و خشت عبث ہی چمک نہیں گئے ہیں
ہم اپنے زخموں کو لائے ہیں اِس مقام پہ خود
کسی کے پاس برائے نمک نہیں گئے ہیں

وہ اور ہیں جو گوشۂ حاصل میں پڑے ہیں
ہم آپ کے اپنے ہیں سو مشکل میں پڑے ہیں
یہ کون سرِ راہگذر ناچ رہا ہے
دیوانے تو جو ہیں وہ سلاسل میں پڑے ہیں
دنیا پہ بس اِس بات سے افتاد پڑی ہے
ہم آج بھی اے دوست ترے دل میں پڑے ہیں
چھایا ہے سرِ شام ہی سناٹا فلک پر
سب چاند ستارے تری محفل میں پڑے ہیں
صد شکر کہ میں یار ترے در پہ کھڑا ہوں
مجھ سے کہیں بہتر تو یہاں گِل میں پڑے ہیں

راہِ حقؑ سے گزر نہیں جاتی
ورنہ دنیا سنور نہیں جاتی
حبِ خیرالبشرؐ کا دعویٰ ہے
اورطبیعت سے شر نہیں جاتی
میں بھی گر مانگتا سلیقے سے
میری جھولی بھی بھر نہیں جاتی
کب مدینے بلایا جاؤں گا
حسرتِ چشمِ تر نہیں جاتی
نور ہی نور ہے مدینے میں

تیرگی اب اُدھر نہیں جاتی
نور سے نور کا معاملہ تھا
خاک تو عرش پر نہیں جاتی
یہ تو عشقِ نبیؐ کی مستی ہے
مے جو ہوتی، اتر نہیں جاتی
شاتمانِ نبیؐ پہ بھیجو موت
بد دعا بے اثر نہیں جاتی

بحرِ وافر مثنیٰ سالم۔جس کے بارے میں صاحبِ 'شہکارِ عروض و بلاغت' پروفیسر انور مینائی اور 'کوہرِ عروض و بلاغت' کے مؤلف کوہر شیخپوروی کا ماننا ہے کہ یہ خاکسار کی ایجاد ہے۔
واللہ اعلم بالصواب۔

یقیں کا گھڑا
ہے اوندھا پڑا
نہ رہ یوں اڑا
لے تو ہی بڑا
ترا میں وہی
'دماغ سڑا'
جو پنچھ نہیں
زباں ہی لڑا
نشہ تھا عجب
میں گر ہی پڑا

زمیں بھی نہیں
جہاں میں کھڑا
کٹھن ہے گھڑی
ہے وقت کڑا
(ق)
کہ موتی ابھی
ہے تہہ میں پڑا
سو مُٹھو کوڈی
کواری ہڑا

خدائے سخن میر تقی میر کے حضور

ڈھونڈا کرے زمانہ مثالیں تمہاریاں
منہہ میں ہمارے خاک جو پالیں تمہاریاں

لائے گا کیا کوئی مرے سوزِ نہاں کی تاب
اِس آنچ پر تو گلتی ہیں دالیں تمہاریاں

جس تس کو مِل رہاہے ملاقات کا شرف
ہم ڈھونڈتے ہیں فون پہ کالیں تمہاریاں

رخ سامنے کرو کہ پیادوں سے کام لو
الٹی پڑیں گی دیکھیو چالیں تمہاریاں

احساسِ سرد وگرم سے نا آشنا ہیں وہ
کاندھوں پہ جن کے رکھی ہیں شالیں تمہاریاں

پھرحشر ہو بپا کہ قیامت کا ہو نزول
زلفیں ہمارے شانوں پہ چھالیں تمہاریاں

تسلیم فکروفن کی عبادت قبول ہو
غزلیں جو ایک بار وہ گالیں تمہاریاں

کہساروں پر رہا ہے دریا
نالوں میں چڑھ رہا ہے دریا
کچی دیوار سے لپٹ کر
اف یہ کیا کر رہا ہے دریا
اُس پار مجھے نہیں ہے جانا
بے کار بپھر رہا ہے دریا
مانگا ہے بھنور کسی نے مجھ سے
اب جبکہ اُتر رہا ہے دریا
وحشت کی یہ کون سی ہے منزل
پانی سے ڈر رہا ہے دریا
مٹی پر جھرّیاں پڑی ہیں
جانے کہاں مر رہا ہے دریا

نہا کے، ڈھنگ سے کپڑے بدل کے دیکھتے ہیں
خیال میں بھی ہم اُس کو سنبھل کے دیکھتے ہیں

تری نظر سے ہمیں گِر کے اچھا لگتا ہے
ہم اِس ڈھلان سے اکثر پھسل کے دیکھتے ہیں

تمہارا نام سنیں اور یہ ٹھہر جائیں
تمہیں تو آنکھ سے آنسو نکل کے دیکھتے ہیں

ہر ایک شخص کو ہم دیکھتے نہیں پھرتے
کسی کسی کو مگر آنکھ مَل کے دیکھتے ہیں

ہم انتظار میں رہتے ہیں اُس پری وش کے
کہ جھونپڑے میں بھی سپنے محل کے دیکھتے ہیں

میں خوش گماں ہوں کہ احباب میری کیچڑ میں
لوازمات نیازیؔ، کنول کے دیکھتے ہیں

یہ جملہ غزلیں 1990 کی دہائی میں کہی گئی تھیں۔
لیکن دونوں مطبوعہ مجموعوں میں شمولیت سے رہ گئی تھیں۔
تیسرے مجموعے میں انہیں شامل کیا جارہا ہے۔

اپنا کمرہ، نِج انگنائی بڑی پیاری لگی
بھیڑ سے لوٹا تو تنہائی بڑی پیاری لگی

راستے میں یوں تو ساری تتلیاں خوش رنگ تھیں
جو ہتھیلی تک نہیں آئی، بڑی پیاری لگی

ایکے رک جانے کا اک اچھا بہانہ مل گیا
مجھکو اپنی آبلہ پائی بڑی پیاری لگی

اُس کو بھی اچھی لگیں بے حد مری بدنامیاں
اور مجھے بھی اُس کی رسوائی بڑی پیاری لگی

رات کے پچھلے پہر خواہش کی دستاویز پر
دستخط سی اُس کی انگڑائی بڑی پیاری لگی

جذبوں کی اتھل پتھل نہیں ہے
تب تو یہ مری غزل نہیں ہے

طاعت ہو یا شراب نوشی
تیرا کوئی بدل نہیں ہے

جب سے ہے بند وہ دریچہ
گلیوں میں چہل پہل نہیں ہے

سینے میں ہے تو ہے ندامت
پیشانی پہ تو بل نہیں ہے

لیجیے میں اے حضور ہارا
اب جھگڑے کا محل نہیں ہے

زندہ ہیں تو مسئلے ہزاروں
مرتے بھی نہیں کہ حل نہیں ہے

مجھ کو ہر شخص کرے پیار ضروری تو نہیں
سب ہو مجھ سا ہی اداکار ضروری تو نہیں

رکنا چاہیں گے تو رکنے کے بہانے ہیں ہزار
سامنے ہو کوئی دیوار ضروری تو نہیں

اس کی آنکھوں نے محبت کی وضاحت کر دی
لب بھی ہوں مائلِ اظہار ضروری تو نہیں

ہو رہی ہے تو غزل ہو، نہیں ہوتی تو نہ ہو
یوں مضامین کی تکرار ضروری تو نہیں

رونا آتا ہو تو رو لو کہیں سناٹے میں
یوں تماشا سرِ بازار ضروری تو نہیں

ڈوبنے والا اگر پار اتر بھی جائے
منتظر ہو کوئی اُس پار ضروری تو نہیں

بارشوں میں کھڑا کچی دیوار میں
جانے کس کی خطا کا سزا وار میں
اُس کو روتا ہوا دیکھ کر رو پڑا
دیکھ کس مرتبے کا اداکار میں
کچھ نہیں ہے تو آخر ہے کیا درمیاں
کس کے اُس پار تو، کس کے اِس پار میں
اِس ضرورت کو آ ہم محبت کہیں
مجھ کو مطلوب تو، تجھ کو درکار میں
رسمِ دنیا ہے ورنہ نیازؔی یہاں
کون اپنا مرا، کس کا غم خوار میں

درج ذیل رباعیوں کے چوبیس مصارع چوبیس مروجہ و مصدقہ اوزانِ رباعی پر مشتمل ہیں۔

درماں ہے تو پھر درد کی ترسیل میں آئے
لو بن کر احساس کی قندیل میں آئے
تشکیک کے دائرے سے نکلے وہ شخص
ہے بھیک تو سائل کی زنبیل میں آئے

﴿اوزان﴾

مفعول مفاعیل مفاعیل فعول
مفعولن مفعول مفاعیل فعول
مفعول مفاعلن مفاعیلن فاع
مفعول مفاعیلن مفعول فعول

رہتا ہوں میں گھر میں بھی کچھ اِس طرح سے آہ
صحرا میں ہوں جیسے بے آب و گیاہ
پل بھر بھی اب سکوں نہیں ہے تسلیم
ہر شے سے بجز اُس کے مجھ کو اکراہ

﴿اوزان﴾

مفعول مفاعِلن مفاعیل فعول
مفعولن مفعولن مفعول فعول
مفعولن فاعِلن مفاعیلن فاع
مفعول مفاعیلن مفعولن فاع

خود پر بیٹھا ہوا سلیماں ہے وہ
اپنے ہی اطراف میں رقصاں ہے وہ
مرنا اُسے آتا ہے مگر اے تسلیم
زندہ ہے اسی لئے پریشاں ہے وہ

﴿اوزان﴾

مفعولن فاعلن مفاعیلن فع
مفعولن مفعول مفاعیلن فع
مفعول مفاعیل مفاعیلن فاع
مفعول مفاعلن مفاعیلن فع

رونے سے مجبور وہ معذورِ نوا
جیسے اک سیارہ محرومِ ہوا
ایسے میں تسلیم اگر دے دے جان
کہتے ہیں محبت میں سب کچھ ہے روا

اوزان

مفعولن مفعول مفاعیل فَعَل
مفعولن مفعولن مفعول فَعَل
مفعولن مفعول مفاعیلن فاع
مفعول مفاعیلن مفعول فَعَل

پھرشوق ہے قدموں سے آگے آگے
پھردل میں کئی رنگوں کے ارماں جاگے
مستی میں جھوم کے پھر اُٹھی ہے حیات
کس نے کھینچے کٹھ پُتلی کے دھاگے

اوزان

مفعول مفاعیلن مفعولن فع
مفعول مفاعیل مفاعیلن فع
مفعولن فاعلن مفاعیل فعول
مفعولن مفعولن مفعولن فع

آؤ بچو ورق ورق یاد کرو

یہ کام ضروری ہے سبق یاد کرو

کوتاہی کو رکھنا تم خود سے دور

ہے فرض اگر کٹھن تو حق یاد کرو

اوزان

مفعولن	فاعلن	مفاعیل	فَعَل
مفعول	مفاعیل	مفاعیل	فَعَل
مفعولن	مفعولن	مفعولن	فاع
مفعول	مفاعلن	مفاعیل	فَعَل

ان کاوشوں میں چند منتخب رباعی گویانِ اردو و فارسی کی رباعیات کے تیسرے غیر مقفیٰ مصرعوں میں قوافی و ردیفین کا تعین کر کے تین طبع زاد مصرعوں کے اضافے کے ساتھ رباعی مکمل کرنے کا تجربہ کیا گیا ہے۔اپنی رباعی سے ایک مثال پیش ہے۔

تسکین کے اسباب کہاں سے لاؤں

پہلی سی تب و تاب کہاں سے لاؤں

جاگی ہوئی آنکھوں کے بیابانوں میں

میں قافلۂ خواب کہاں سے لاؤں

دن بیتے تھے جو عشق کے طوفانوں میں

رکھے ہیں ابھی تک مرے سامانوں میں

بھرتے ہیں قلانچیں ترے خوابوں کے غزال

"جاگی ہوئی آنکھوں کے بیابانوں میں"

(تسلیم نیازی)

”دل دادم و جاں دادم و ایماں دادم“
پھر بھی وہ بتِ ناز ہے مجھ پر برہم
مجھ سے تو فقط وعدے پہ وعدہ ہر دم
ہوتا ہے شب و روز رقیبوں پہ کرم
(سرمد)

رہتا ہوں شبستاں میں بھی میں ایسے آہ
صحرا میں ہو جیسے کوئی بے آب و گیاہ
تسلیم نیازی مجھ پاگل کے لئے
”چہ کفر، چہ اسلام، چہ طاعت، چہ گناہ“
(خیام)

”تھا چشمۂ آبِ زندگانی نزدیک“
شب بھر تھی جوانی کے جوانی نزدیک
پھر یاد نہیں بات کہاں تک پہنچی
کوشش سے تھی مگر کامرانی نزدیک
(میر)

”اللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں“
اک ٹیس کسی طور سے جاتی ہی نہیں
ہوتی ہی نہیں پوری ہے خواہش ایسی
امید ہے ایسی کہ بر آتی ہی نہیں
(غالب)

"کھوئی ہے وہ چیز جس کا پانا ہے محال"
اب اس کا بدل ڈھونڈ کے لانا ہے محال
وہ لوٹ کے گھر آئے مشکل ہے بہت
تسلیم گئے وقت کا آنا ہے محال
(حالی)

دن رات دریچے میں آنگن رکھے
گلیوں کی نگاہوں کو مسکن رکھے
ہمسایے، سخاوت پہ تری جان نثار!
"اللہ تری شمع کو روشن رکھے"
(جوش)

خراج پارے

لفظوں کے دھنی فکر کے راجا نادم
تاب وتب اردوئے معلی نادم
نقاد بھی، شاعر بھی، عروضی بھی واہ
رکھتے ہیں نیازی یدِ طولیٰ نادم
پروفیسر نادم بلخی کے نام!

مجھ جیسے فقیروں سے لپٹنے والے
صدیق مجیبی، وہی پٹنے والے
وہ شاعرِ شہباز ہیں تسلیم میاں
صیدانِ مضامیں پہ جھپٹنے والے
ڈاکٹر صدیق مجیبی کی نذر

الفاظ کے گلزار ہیں محبوب انور
اک شاعرِ فنکار ہیں محبوب انور
جس شہر کا معیار نیازی تو ہے
اُس شہر کے معمار ہیں محبوب انور

محبوب انور کی نذر!

خطاط ہیں اِس طرح کہ خط بولتا ہے
مکتوب معانی کی گرہ کھولتا ہے
اللہ رے اندازِ جنابِ مضطر
ہر نقش مثالِ گلِ تر ڈولتا ہے

شاعرِ خوش نوا مضطر عظیم آبادی کے نام

احساس پہ اظہار کی شاہنشاہی
یوں لازم و ملزوم کہ آب اور ماہی
جدت کے نہالوں پہ روایت کے ثمر
اللہ رے اسلوبِ علیم الٰہی

ڈاکٹر پروفیسر علیم اللہ حالی صاحب کی نذر

کلکتے میں ہے کون......سوائے شبلی
عالم ہے رواں سوئے سرائے شبلی
اِس حبس میں تسلیم جی مرجاتا فن
بنتی نہ اگر یہاں ہوائے شبلی

محترم علقمہ شبلی صاحب کی نذر

افسانہ نگاری میں شہباز سلیم
اسلوبِ غزل کے بھی ہمراز سلیم
دونوں ہی اصناف پہ ہے ان کی گرفت
دونوں ہی صفات سے سرافراز سلیم

سلیم سرفراز کی نذر!

زر اور ہی کچھ شے ہے، سیم اور ہے کچھ
صرصر ہے الگ، بادِنسیم اور ہے کچھ
بازار میں ڈھیروں ہیں کتابیں لیکن
دیوانِ ورق ورق شمیم اور ہے کچھ

ورق ورق شمیم (دیوانِ رباعیات) کے خالق شمیم انجم وارثی کی نذر

جگنو کے ارد گرد بُن کر جالے
بیٹھے ہوئے نادان ہیں گھیرا ڈالے
روئی سے چھپاتے ہیں چنگاری کو
بچے ہیں کچھ سفید بالوں والے

چگنا کسے کہتے ہیں، تگ و تاز ہے کیا
گُنجشک کسے کہتے ہیں، شہباز ہے کیا
تسلیم بتاؤ ان ناداروں کو
اِمداد کسے کہتے ہیں، اعزاز ہے کیا

اپنا ہے ہمارا نہ یہ امریکہ نہ روس
آندھی کے طرفدار ہیں سارے فانوس
ہم سوئے ہیں چھپ چھپ کے خود اپنے اندر
ہم پر ہے ابھی زمانہ دقیانوس

جمہور کے نغمے تو سنانے کے ہیں
وہ اصل میں پتھر کے زمانے کے ہیں
دو دانت جو آتے ہیں نظر ہاتھی کے
کھانے کے نہیں ہیں وہ دِکھانے کے ہیں

پھولوں کی پتیاں بکھیریں آؤ
آوارہ تتلیوں کو گھیریں آؤ
ہم جن پہ جلا کرتے تھے شمعوں کی طرح
ویران ہیں وہ ساری منڈیریں آؤ

سورج کو ہتھیلی پہ لے لیں آؤ
سچ کہنے کی دشواریاں جھیلیں آؤ
بچپن میں تو اس کھیل کو کھیلا ہے بہت
اک بار جوانی میں بھی کھیلیں آؤ

سانپوں سے رسم و راہ زنہار نہ رکھ
موذی کو کبھی اپنا نگہدار نہ رکھ
ہے ان کی سرشت میں بغاوت داخل
سوتے میں سرہانے کبھی تلوار نہ رکھ

آنکھوں میں کوئی چیز بجز خواب نہ رکھ
بے فیض اداسی کے اسباب نہ رکھ
موسم کی رعایت سے اگ آئیں گے سراب
ان ریت کے تودوں پہ کبھی آب نہ رکھ

شکر پارے

کس درجہ بڑے تھے ہم جب بچے تھے
بیباک تھے، عقل کے بڑے کچے تھے
کرتے نہ تھے ماں باپ کی تابعداری
مخلص تھے، خلیق تھے، بڑے سچے تھے

دو پل نہ کبھی چین سے بیٹھے پپا
دن رات نہ جانے کیا ڈھونڈے پپا
منی کو مٹی کا ہاتھی دے کر
سونے کی ہرنی پر جھپٹے پپا

"اپنے سے بڑوں کی باتیں سنتے ہیں
بچے جو جھگڑتے نہیں وہ اچھے ہیں"
کرتے ہیں رات دن نصیحت پپّا
خود انکل سے مقدمہ لڑتے ہیں

"مل جل کے رہو" امی کہا کرتی ہیں
باتیں وہ سدا بیش بہا کرتی ہیں
ممی سے پوچھتی ہے ناداں منی
"دادی کیوں گاؤں میں رہا کرتی ہیں؟"

چائے کی پیالیاں

چائے کی دوسری پیالی ہے
دوسری ہے کہ تیسری شاید
چائے کی دوسری پیالی ہی ہے
جسے میں گھونٹ گھونٹ پی رہا ہوں
کیونکہ پہلی کو میں نے پہلے ہی
پی کے اک گھونٹ توڑ ڈالا تھا
بد مزہ تھی اسی لئے شاید
اِس لئے مجھکو ایسا لگتا ہے
چائے کی دوسری پیالی ہی
سامنے میرے ہے دھری فی الحال
جسے میں گھونٹ گھونٹ پی رہا ہوں

ویسے اک تیسری پیالی بھی
میز پر یاد ہے کہ آئی تھی
جانے کس سوچ میں رہا تھا میں
جانے کس کام میں تھا میں مصروف

دھیان آیا تو دیر ہو چکی تھی
رکھی رکھی وہ ٹھنڈی ہوچکی تھی
اور پھر ایک بار یوں بھی ہُوا
جی کیا میرا کہ پیوں میں اسے
جوش میں نے دیا، پیا بھی اسے
گرم کر کے اسے پیا کئی بار

آج بھی گرم کرتا رہتا ہوں
میں اسے پی مگر نہیں سکتا
ہاں مگر اب میں جاننے لگا ہوں
گرم کرنا الگ ہے، پینا الگ
کئی ندیاں، پہاڑ، دشت و دمن
عمر، ناموس، خوف، شرع، اصول
ایک اک گام پر ہیں یاں حائل
گرم کرنے کے اور پینے کے بیچ
چائے کی دوسری پیالی ہے
جسے میں گھونٹ گھونٹ پی رہا ہوں

پیڑ گھنیرا

سوکھ گیا وہ سبز، گھنیرا پیڑ
کہ جس پر
لوریاں اور پریوں کے قصے
بارہ ماس پھلا کرتے تھے
جس کی ٹھنڈی چھاؤں میں میں نے
گھٹنوں کے بل چلتے چلتے
پاؤں پاؤں چلنا سیکھا تھا
میں نے جس کی شاخ شاخ جھولا جھولا تھا
سوکھ گیا وہ پیڑ گھنیرا
میں نے اپنی ماں کو کھویا
تو یہ جانا
میرے پاس بھی
اتنی قیمتی چیز رہی تھی
آخر کو کھونے کی خاطر

﴿ختم شد﴾

پیاسا مسافر

آہ پیاسا مسافر بچارہ!

پھرتا رہا مدتوں

شہر در شہر، صحرا بہ صحرا......

کہ اک روز اُس کو

خوش قسمتی نے پکارا

مسافر بچارے کو مل ہی گیا

ٹھنڈے پانی سے لبریز چشمہ

کہ جنت سے جیسے خدا نے

بس اُس کی ہی خاطر اتارا

بچارے مسافر نے جی بھر کے پانی پیا

شکرِ ربِ تعالیٰ گزارا

اور پھر اُس نے چشمے کے منہ کو

اتنی بڑی ایک چٹان سے ڈھک دیا

کہ خود بھی جو چاہے تو اُس کو اٹھا نہ سکے

وہ دوبارہ!!

واہ...... پیاسا مسافر بچارہ!!!

نجات نامہ

فضا بن گئی تھی

عجب داستانی

فراغت ملی تھی مجھے آسمانی

ہوس خیز جلوے ادا آزما تھے

نمائش بپا تھی

ستاروں سے بھیجی گئیں اپسرائیں

مقابل کھڑی تھیں

بدن قوس تانے

....

میں خوف و خرد کو لگا کر ٹھکانے

زمان و مکاں کا عقوبت کدہ توڑ کر

ابھی اک قدم ہی تو

بے احتیاطی کی جانب بڑھا تھا

ابھی ایک ساعت بھی گزری نہ ہو گی

کہ میں شب گناہی پہ مائل ہُوا تھا

ابھی ایسا ویسا کیا کچھ کہاں تھا

....

کہ ''راہل'' زور سے رویا

''یشودھرا'' نے لی انگڑائی

جاگ پڑے سے

سوکھ گیا بستر کا برگد

اور ہُوا نروان معطل

دفتر سے گھر لوٹ آنے تک

....

نکل پڑا میں

ضرورتوں کے سیاہ رتھ پر سوار ہوکر

نجات۔بندھن کی سلسلہ وار داستاں کی

نئی وضاحت تلاش کرنے!

خود ہی (خود سے) سوال کرنے!!

خود ہی (خود کو) جواب دینے!!!

﴿ختم شد﴾

پروفیسر نادم بلخی مرحوم کے قلمی اشتراک سے لکھا گیا ایک بیس سال پرانا رینگا شاملِ مجموعہ کر رہا ہوں۔ یہ اس حقیقت پر دال ہے کہ مجھ میں آج بھی بچپنا موجود ہے۔

رینگا

(۱)

مجھ کو تڑپائے

اُس سے وہ پہلا سنگم

جب بھی یاد آئے

بارش کا بھیگا موسم

سینوں کا وہ زیر و بم

(۲)

سانسوں میں خوشبو

سونپی مجھ کو کستوری

اور بھاگا آہو

وہ تھی اک ساعت نوری

جب سمٹی تھی ہر دوری

﴿ختم شد﴾

دوہے

گوری اکیلی کیا گئی چھوڑ کے اپنا گاؤں
پنگھٹ سے پانی گیا اور پیپل سے چھاؤں

گوری لے کر چل پڑی سکھ کے دونوں روپ
اک گھڑی میں چاندنی، اک گھڑی میں دھوپ

لاکھ دہائی دے کوئی، منت کرے ہزار
گوری گھوڑا بیچ کر سوئی ہے اِس بار

چلتا نہیں تسلیم جی، دل پہ کسی کا زور
چیخ اٹھیے تو شانتی، چُپ رہیے تو شور

بیداری احساس کی مانگے روز خراج
میں سونا تسلیم جی، مٹی کا محتاج

متفرقات

صورت نبیؐ کی ہائے نبیرہ رسولؐ کا
نورِ نبیؐ، سراجِ منیرہ رسولؐ کا
تھوکے گی خون دیکھنا، تڑپے گی حشر تک
کھایا ہے جس زمین نے ہیرا رسولؐ کا

موسم کی بلیہاری
برف کی وادی میں
اگنے لگی چنگاری

اللہ رے سلطانی
بلقیس کے کاندھوں پر
اورنگِ سلیمانی

کمانا اور ہی کچھ تھا، گنوانا اور ہی کچھ تھا
مری ماں کا دیا آنہ دو آنہ اور ہی کچھ تھا

میں نے دیوار بوئی تو کچھ بھی نہیں
کنکری اس نے پھینکی تو گھر اگ گیا

مجھ کو بتلا کے پتا اپنے خزانے والا
پیش گامی پہ مری شور مچانے والا

زندگی کیا ہے بس اک بند لفافہ کہ جسے
خود وہی بھیجنے والا ہے جو پانے وا

تراجم

☆بنگالی:- پورنیندو پتری ☆ اردو:- تسلیم نیازی

(۱)

آئی تھی وہ، آ کر چلی بھی گئی
شام کی ملگجی روشنی نے اسے دیکھا ہے
ندی کے اُس پار
ندی نے بھی اُسے
ملگجی ساری میں دیکھا ہے

برگد کی جڑوں کی لمبی قطار
برگد کے پتوں کی بڑی بڑی آنکھیں
آنکھوں میں نیلے چہ بچے
چہ بچوں کے پوشیدہ پانی میں
گمراہ خوابوں کی کرچیاں
مچھلیوں کی طرح تیرتی ہیں
جسے وہ کھونے والی ہے
اُسے پانے کی تمنا کیوں؟

بند دروازہ توڑ کر

ہر نیند والی رات

پھر بھی

اُس کا آنا اُس کے لئے

جسے وہ پا نہیں سکتی

آئی تھی وہ،

آ کر چلی بھی گئی

میں ہنوز اُس کی خوشبو اوڑھ کر

خاردار گھاس پر سو رہا ہوں ﴿ختم شد﴾

(۲)

چمکارنے سے پہلے ہی اُڑ کر آیا

اور گھر کی منڈیر پر

بیٹھ گیا وہ زرد پرندہ

اِس خرابے میں

اُسے کہاں بٹھاؤں میں

آسمان سے خبریں لایا ہے

وہ اپنے پروں پر لکھ کر

چودھویں کے چاند کا تبسم

ہونٹوں پر مَل کر

لائلکن کی اُس کی ساری کو

خبر ہے کہ ہوا نے دھویا ہے

ستاروں نے سہیلیوں کی طرح

اُس کی زلفیں سنواری ہیں

چھویا تو محسوس ہُوا

اُسے تو تیز بخار ہے

بیہوش ہونا ہی باقی رہ گیا ہے

زرد پرندے کو

میں اُس کے کُل کے ساتھ

کہاں رکھوں؟!؟